Phone: 7500

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

جولائی 1962ء

اسلامی حکومت کی ذمہ داریاں

حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ عام خطبہ میں فرمایا۔

ایہا الناس ان اللہ قد کلفنی ان اصرف عنہ الدعاء۔
لوگو! مجھے اللہ نے اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں
اس کے حضور جانے والی تمہاری دعاؤں کو روکوں۔

مطلب یہ ہے کہ جو ضرورت مند اپنی کسی ضرورت کے لئے خدا سے دعا کرے، میں اس کی ضرورت یہیں پوری کر دوں اور اس طرح اس کی دعا کو خدا تک جانے کی ضرورت ہی نہ رہے۔

یہ ہے اسلامی حکومت کا فریضہ۔ یعنی مخلوق کی جن ضرورتوں کے پورا کرنے کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے، ان کا پورا کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

اسلامی حکومت کے فرائض کو کسقدر جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے!

شائع کردہ:

ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت ۷۵ پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک
ہند و پاکستان سے سالانہ — آٹھ روپے
غیر ممالک سے — ۱۶ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہند و پاکستان
۷۵ نئے پیسے

ٹیلیفون نمبر ۷۵۰۰
خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ۔ لاہور

نمبر ۷	جولائی ۱۹۶۲ء	جلد ۱۵

فہرست مضامین

لمعات ـــــ ۲
امر بالمعروف و نہی عن المنکر ـــــ ۱۷
حقائق و عبر ـــــ ۲۹
گھروں کا چین گھروں کی سلامتی (بیگم سکندرہ ریاض) ـــــ ۳۳
علم جغرافیہ اور قرآن پاک (ڈاکٹر مس مریم خان) ـــــ ۴۱
ہماری تعلیم (محترمہ حمیدہ جہاں آرا خواجہ) ـــــ ۴۶
امریکہ سے ایک خط (پروفیسر سعیدہ اختر) ـــــ ۵۱
علمائے کرام سے گزارش (بنت اسلام) ـــــ ۵۵
دین میں غلو ـــــ ۵۸
لمحۂ فکریہ ـــــ ۶۳
نقد و نظر ـــــ ۷۲
رابطۂ باہمی ـــــ ۷۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

یوں تو حقیقت یہی ہے کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

لیکن انیسویں صدی میں "شرارِ بولہبی" کی ستیزہ کاری نے جو پینترہ اختیار کیا، وہ اپنی ہلاکت سامانیوں کے اعتبار سے سب سے زیادہ شدید اور خطرناک تھا۔ اس سے سر سے سے قصرِ اسلام کی جڑ کٹ جاتی تھی۔ یہ تھا مغربی نیشنلزم (قومیت) کا وہ تصور جسے یورپ نے مسلمانوں کے ممالک میں عام کرنا شروع کیا۔ اس تصورِ قومیت کی بنیاد یہ تھی کہ کسی ایک خطۂ زمین میں بسنے والے انسان، بلا تمیزِ مذہب، ایک قوم کے افراد ہوتے ہیں۔ ان کا تمدن، تصورِ حیات، نہجِ زندگی، خارجی حوادث کے خلاف ردِ عمل، زاویۂ نگاہ، طرزِ فکر و عمل وغیرہ ایک ہوتا ہے۔ مذہب کی تفریق، "اعتقادات اور عبادات" تک محدود ہوتی ہے، جن کا انسان کی اجتماعی زندگی سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ قوم کی اجتماعی زندگی اُس سانچے میں ڈھلتی ہے جسے وہ اپنے لئے آپ تجویز کرتی ہے۔

قومیت کا یہ تصور، اسلام کی اصل و بنیاد کے خلاف تھا۔ اسلام کا تصورِ زندگی یہ ہے کہ انسانوں کی تقسیم اور قومیت کی تشکیل، آئیڈیالوجی کی بنا پر ہوتی ہے۔ اسلام ایک مخصوص اور منفرد آئیڈیالوجی پیش کرتا ہے جو ذہنِ انسانی کی وضع کردہ نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لئے وحی کی رُو سے ملی ہے۔ یہ آئیڈیالوجی قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ دنیا کا جو انسان اس آئیڈیالوجی کی صداقت کو تسلیم کرتا ہے، وہ اسلامی برادری (قومیت) کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ جو اس سے اختلاف کرتا ہے، وہ دوسری قوم کا رکن ہوتا ہے۔ چونکہ اسلامی ہیئتِ اجتماعیہ کی پوری عمارت، اس آئیڈیالوجی کی بنیادوں پہ استوار، ہوتی ہے، اس لئے اسلامی قومیت

کا فلسفہ تصورِ حیات، اندازِ نگاہ، خارجی حوادث کے خلاف ردِعمل، غیر اسلامی قومیت سے بالکل مختلف، متمیز اور منفرد ہوتا ہے۔ ان دونوں کا ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا تو ایک طرف، ان میں نہ مفاہمت ہو سکتی ہے نہ مداہنت (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) اسلام اپنی ہیئتِ اجتماعیہ کے اصولوں میں اپنے اندر کوئی لچک نہیں رکھتا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ مغرب کا تصورِ قومیت، کس طرح اسلام کے خلاف سب سے کاری حربہ اور اپنی تباہ کاریوں کے اعتبار سے سب سے زیادہ شدید اور مہلک تھا (اور ہے)۔ یہی وجہ تھی کہ حکیم الامتؒ نے برملا کہہ دیا کہ یہ تصورِ قومیت

غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے

انگریز نے اس تصورِ قومیت کو ہندوستان میں پھیلایا۔ اور چونکہ اس میں ہندوؤں کو اپنے لئے بڑے مفاد مضمر نظر آتے تھے، اس لئے انہوں نے اسے خاص طور پر ہوا دی، اور اشتراکِ وطن کی بنا پر، ہندو مسلم کے امتزاج سے ہندی قومیت کا احساس بیدار کرنا شروع کر دیا۔ یہ ہماری انتہائی خوش بختی اور مبداءِ فیض کی کرم گستری تھی کہ عین اس زمانہ میں یہاں سرسید جیسا دیدہ ور مصلح پیدا ہوا جس کی نگہِ دوررس نے اس مہیب خطرہ کو بھانپا اور کامل جرأت اور بلند حوصلگی سے اس حقیقت کا اعلان کیا کہ ہندو اور مسلمان، دو الگ الگ قومیں ہیں، جو کسی صورت میں بھی ایک قوم نہیں بن سکتے۔ اس مقصد کے لئے، اس نے ہر وہ ذریعہ اختیار کیا جو اس زمانے کے حالات میں مناسب اور ممکن العمل تھا جس سے مسلمانوں میں اپنی جداگانہ انفرادیت کا احساس بیدار ہو اور وہ ایک الگ قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے میں فخر محسوس کریں۔ اس وقت اس سلسلہ میں اس کے پیشِ نظر دو اہم خطرات تھے۔۔۔ ایک برہمو سماجی تحریک اور دوسرا عیسائی مشنریوں کا جال جو ملک کے طول و عرض میں پھیلایا جا رہا تھا۔ برہمو سماجی تحریک کی بنیاد اس دامِ ہمرنگِ زمین پر تھی کہ تمام مذاہب میں عالمگیر سچائیاں یکساں طور پر موجود ہیں۔ کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر کوئی فضیلت نہیں۔ ہمیں تمام مذہبی کتابوں سے اخلاق سے متعلق اچھی اچھی باتوں کو چن لینا چاہیئے اور ان پر اپنے اپنے طور پر عمل پیرا ہو جانا چاہیئے۔ یہی مذہب کا منتہیٰ اور انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے ذہن میں اپنے دین کی فضیلت اور فوقیت کا جو احساس موجود تھا اسے مفلوج کر دیا جائے اور اس طرح مذہب کی بنا پر جداگانہ انفرادیت کے تصور کو ختم کر دیا جائے۔

عیسائی مشنریوں کا پروگرام یہ تھا کہ جگہ جگہ اسکول اور کالج قائم کر دیئے جائیں اور ان میں ایسی تعلیم دی جائے جس سے مسلمان طالب علم اگر عیسائی نہ بھی ہوں تو کم از کم اپنے دین کی حقانیت اور صداقت

کے بارے میں ان کے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں، اور وہ اسلام کی افضلیت اور فوقیت کو تنگ نظری پر محمول کرنے لگ جائیں۔ انہوں نے ان کے دل میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لئے، ایک طرف سائنس کی تعلیم کو عام کیا، اور دوسری طرف ان وضعی روایات اور اسرائیلی تفاسیر کو آگے بڑھایا، جو بدقسمتی سے ہمارے اسلامی لٹریچر کا جزو بن چکی تھیں، اور جن سے توہم پرستی عام ہو تی تھی۔

سرسیدؒ نے اس مہیب خطرہ کی روک تھام کے لئے ضروری سمجھا کہ مسلمانوں کی تعلیم کا جداگانہ انتظام ہو۔ اس نے اس کا انتظام کیا۔ توہم پرستی کے ازالہ کے لئے، اس نے ان وضعی روایات اور اسرائیلی خرافات کی شدومد سے تردید کی جنہوں نے اسلام جیسے یکسر علم و بصیرت پر مبنی دین کو، توہم پرستیوں کا گورکھ دھندا بنا رکھا تھا۔ دوسری طرف اس نے، علوم سائنس کی تحصیل پر بڑا زور دیا، اور اپنے دور کی علمی سطح پر، قرآنی تعلیم کو مطابق علم و عقل ثابت کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ قدامت پرست مذہبی طبقہ نے، جو بدقسمتی سے، کبھی واقعات (FACTS) کا سامنا نہیں کرتا بلکہ جذبات کی رَو میں شدت سے بہ جاتا ہے، سرسیدؒ کی سخت مخالفت کی۔ لیکن اس مردِ حق کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ اگر ان کوششوں میں ذرا بھی کوتاہی کی گئی تو ہندوستان میں مسلمانوں کی جداگانہ ہستی ختم ہو جائے گی۔۔ ان کی مخالفت کی ذرا پرواہ نہ کی اور اپنی دھن میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ منکرِ حدیث "ٹھیرایا گیا۔ نیچری کہلایا۔ ملحد اور بے دین بتایا گیا۔ اس پر کفر کے فتوے لگے جو مکہ معظمہ تک سے منگائے گئے۔۔ اس نے سب کچھ برداشت کیا لیکن قوم کو آنے والے خطرات سے بچا لیا۔ ذرا سوچئے کہ اگر وہ ان مخالفتوں کے ہجوم سے گھبرا کر اپنی کوششوں کو ترک کر دیتا تو آج یہاں مسلمانوں کی حالت کیا ہوتی؟ خدا ملت کے اس محسنِ اعظم کو کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے۔ اس نے آخری دم تک اس جدوجہد کو جاری رکھا، اور پھر اس شمع کو اقبالؒ جیسے قرآنی مفکر، دانائے راز، کے ہاتھوں میں دے کر، اطمینان سے اگلی دنیا کی طرف چلا گیا (رحمہ اللہ تعالیٰ)

اقبالؒ کی ساری عمر مسلمان کو یہی سمجھانے میں گزر گئی کہ

اسلام تیرا دیس ہے، تو مصطفوی ہے

اس کے کلام کو شروع سے اخیر تک پڑھ جائیے، ایک اعلانِ جنگ ہے مغرب کے تصورِ قومیت کے خلاف، اور ایک صورِ اسرافیل ہے مسلمانوں میں اس جذبہ کے بیدار کرنے کے لئے کہ اسلام خدا کا آخری دین ہے جو تمام نوعِ انسان کی راہ نمائی کے لئے دیا گیا ہے۔ یہ وہ واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے جس کا مقابلہ نہ دنیا کا کوئی مذہب کرسکتا ہے نہ نظامِ زندگی۔ مسلمان آئیڈیالوجی کی بنا پر ایک منفرد امت ہیں جس کا ادغام کسی قوم

میں نہیں ہو سکتا۔ یہ اشتراکِ وطن کی بنا پر ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے۔ ان کی انفرادیت اور جداگانہ قومیت کا تقاضا ہے کہ ان کی اپنی آزاد مملکت ہو جہاں یہ اپنے خدا کے متعین کردہ پروگرام کو عملاً متشکل کر سکیں۔

سید کی طرح اقبالؒ کی بھی مخالفت ہوئی۔ اور سخت مخالفت۔ اور ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ یہ مخالفت بھی، ہمارے علمائے کرام ہی کی طرف سے ہوئی۔ انہوں نے، اس کے پیغام کی مخالفت میں ـــ جو درحقیقت قرآن کا پیغام تھا۔ ہندوؤں کے ساتھ مل کر "متحدہ قومیت" کی بنیاد ڈالی اور اسے عین اسلامی تعلیم کے مطابق قرار دیا۔ اس مقصد کے لئے "برہمو سماجی اسلام" کو پھر سے زندہ کیا گیا اور کہا گیا کہ "عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔" (مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم) اس لئے اسلام کو دیگر مذاہب پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ مذہب کا تعلق "اعتقادات و عبادات" سے ہے۔ باقی رہے دنیاوی معاملات، سو ان سے مذہب کا کوئی واسطہ نہیں۔ یہاں تک بھی کہہ دیا گیا کہ اسلام نے، آئیڈیالوجی کی بنا پر قومیت کی تشکیل کا ایک تجربہ کیا تھا، لیکن وہ (معاذ اللہ) ناکام رہا، لہٰذا اسے پھر سے دہرانا، حماقت ہے۔[1] مسلمانوں کی جداگانہ درسگاہوں کو ختم کر دینے کی ہر ممکن کوشش کی گئی اور ان کی جگہ "قومی درسگاہیں" قائم کی گئیں۔ غرضیکہ مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کو ختم کرنے کے لئے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا دیا گیا۔ لیکن اقبالؒ اپنی دھن میں آگے بڑھتا گیا تاآنکہ اس نے ۱۹۳۰ء میں ایک آزاد، جداگانہ مملکت کے قیام کا نصب العین مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا۔ وہ یہی کچھ کہتا ۱۹۳۸ء میں، سوئے جنت روانہ ہو گیا اور اس مشعل کو جناحؒ جیسے رہبرِ فرزانہ کے آزمودہ کار ہاتھوں میں دے گیا (فجزاہ اللہ احسن الجزا)

اقبالؒ کی زندگی میں، مغربی نیشنلزم کے مقابلہ میں ایک اور تحریک اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے (ایک حد تک) کامیاب ہو گئی۔ اسلام کے لئے یہ تحریک، مغربی قومیت سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ اس لئے کہ تشکیلِ قومیت کے لئے اس نے بھی وہی اصول اختیار کیا جو اسلام نے پیش کیا تھا۔ یعنی یہ اصول کہ قومیت کا مدار، وطن کا اشتراک نہیں بلکہ آئیڈیالوجی کا اشتراک ہے۔ لیکن اس نے آئیڈیالوجی پیش کی جو اسلام کی یکسر نقیض تھی۔ یہ تھی روس کی کمیونزم کی تحریک۔ اسلام کے لئے، اس کے زیادہ خطرناک ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ تحریک جو معاشی پروگرام پیش کرتی تھی وہ، اسلام کے معاشی پروگرام سے ملتا جلتا تھا، اس لئے سطح بین نگاہیں اس کا جلد شکار ہو سکتی تھیں ـــ اور ہوتی جا رہی تھیں ـــ اقبالؒ نے اس جدید خطرہ کو بھی بھانپا اور قوم کے نوجوانوں کو بتایا کہ جو معاشی نظام تمہیں کمیونزم کی طرف کھینچ رہا ہے، وہ اسلام میں بھی مل جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی تم اس انسانیت سوز تباہی

---

[1] دیکھئے مولانا آزاد مرحوم کی آخری کتاب آزادیٔ ہند (انگریزی) جس پر طلوعِ اسلام کی جون ۱۹۵۹ء میں تبصرہ کیا گیا تھا۔

سے بھی محفوظ رہو گے جو کمیونزم کے لادینی فلسفہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ ان کا قول یہ تھا کہ

BOLSHEVISM PLUS GOD IS ALMOST IDENTICAL WITH ISLAM[1]

یعنی اگر بالشوازم میں "خدا" کا اضافہ کر دیا جائے تو وہ قریب قریب اسلام کے مماثل ہو جاتی ہے۔

اس کے لئے وہ قائداعظم کو بار بار تاکید کرتے تھے کہ جس جداگانہ مملکت کے قیام کے لئے ہم کوشش کر رہے ہیں اس میں اسلام کا معاشی نظام ضرور نافذ کیا جائے۔ کیونکہ یہی چیز کمیونزم کے سیلاب کو روک سکے گی۔

قائداعظمؒ نے اس جدوجہد کو جاری رکھا، اور، ہندو اور انگریز کے علاوہ، مسلمان قومیت پرستوں کی سخت مخالفت کے باوجود، اپنی دھن میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ مذہب پرست طبقہ نے ان کی بھی مخالفت اور رکھتے ہوئے شدومد آتی ہے، ان کی تذلیل، وتحقیر اور استخفاف و استہزاء میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ تنگ نظر حاسدوں کا یہ عام وطیرہ ہے کہ جب وہ کسی تحریک کے خلاف کوئی دلیل نہیں لا سکتے"

تو اس تحریک کے بانی پر ذاتی حملے شروع کر دیتے ہیں۔۔۔ سرسیدؒ اور اقبالؒ کے خلاف بھی یہی کچھ کیا گیا، اور ان کے بعد قائداعظمؒ کے خلاف بھی۔ اس مخالفت میں نیشنلسٹ مسلمانوں کے ساتھ ایک اور جماعت بھی شامل تھی (بلکہ قائداعظم کی مخالفت میں ان سے بھی زیادہ تیز تھی) جس کی پالیسی عجیب تحیر انگیز تھی۔ یہ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی بھی تائید کرتی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی مطالبہ پاکستان کی سخت مخالف بھی تھی۔ ظاہر ہے کہ اگر مسلمان، حصولِ پاکستان کی کوششوں میں ناکام رہ جاتے، تو ہندوستان میں رہتے ہوئے ان کی جداگانہ قومیت کچھ معنی نہ رکھتی۔ مغربی تصور قومیت کی رو سے، ایک ملک کے اندر رہتے ہوئے، آئیڈیالوجی کے اختلاف پر جداگانہ قومیت کی تشکیل ہو ہی نہیں سکتی۔ وہاں تو انہیں مذہبی اقلیت کی حیثیت سے رہنا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس جماعت کی طرف سے تحریک پاکستان کی اصولی اور قائداعظمؒ کی ذاتی مخالفت، بڑی تعجب انگیز تھی۔

ان تمام مخالفتوں کے علی الرغم پاکستان وجود میں آ گیا اور وہ بات سرسیدؒ نے ۱۸۶۷ء میں کہی تھی (کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں)، جسے اقبالؒ نے دین کا بنیادی تقاضا بتایا تھا۔ اور جسے قائداعظمؒ نے مسلمانوں کی موت اور حیات کا معیار قرار دیا تھا، وہ اپنی محسوس شکل میں دنیا کے سامنے آ گئی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

---

[1] سر فرانسس ینگ ہسبینڈ کے نام خط مورخہ ۳۰ ۶/۳۴

لیکن جس وقت، دنیا کی آنکھ، اس حقیقت منتظر کو یوں بیاباں مجازمیں دیکھ رہی تھی، دوسری طرف وہ اس تماشا کو دیکھ کر بھی محو حیرت تھی کہ وہ تمام عناصر جو آخری وقت تک نظریۂ پاکستان کی مخالفت کرتے رہے، ہجوم کر کے پاکستان کی طرف آ گئے ۔۔۔ چنانچہ یہ تمام عناصر ۔۔۔ ہندوستان سے آنے والے، اور ان کے ہم نوا جو پہلے سے یہاں موجود تھے ۔۔۔ اس وقت سے آج تک، بدستور پاکستان کے بنیادی نظریہ کی مخالفت میں مصروف ہیں، اور ان کی یہ مخالفت آہستہ آہستہ رنگ لا رہی ہے۔ اور مقام صد تاسف یہ کہ ان " دانا دشمنوں " کے ساتھ " نادان دوستوں " کی حماقتیں بھی کچھ کم درجۂ تخریب نہیں۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی ہو گی کہ نظریۂ پاکستان (یا بالفاظ دیگر، مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے نظریہ) کا دار و مدار اس پر ہے کہ قوم کا اس پر ایمان ہو ۔۔۔ یعنی انہیں علی وجہ البصیرت یقین محکم ہو کہ

(۱) دنیا میں اسلام ہی وہ نظام حیات ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان ۔۔۔ فرد، قوم اور پوری کی پوری انسانیت ۔۔۔ اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چلنے سے، اقوام عالم ان مصیبتوں سے نجات حاصل کر سکتی ہیں جن میں وہ اس وقت، اس بری طرح سے مبتلا ہیں۔ لہٰذا دنیا کا کوئی مذہب، اور کوئی نظام سیاست و تمدن، اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسلام، تمام مذاہب اور ادیان سے افضل اور اعلیٰ ہے۔

(۲) اسلام مذہب نہیں جس کا تعلق محض چند اعتقادات، عبادات، یا زیادہ سے زیادہ پرسنل لاز (شخصی قوانین، مثلاً نکاح، طلاق) سے ہوتا ہے۔ یہ ایک کلی نظام ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے۔ اس میں مذہب اور سیاست الگ الگ شے نہیں۔

(۳) اسلام کے بحیثیت نظام حیات ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک آزاد مملکت میں ہی بروئے کار آ سکتا ہے۔ پاکستان اسی مقصد کے پیش نظر حاصل کیا گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ جس قدر ان امور پر یقین، محکم ہوتا جائے گا، اُسی قدر پاکستان مستحکم ہوتا جائے گا۔ جس قدر اس یقین میں کمی آتی جائے گی، اسی نسبت سے پاکستان کمزور ہوتا جائے گا۔ جن تخریبی عناصر کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کی مسلسل کوشش یہ ہے کہ مسلمانان پاکستان (بالخصوص ہماری نئی نسل) کے دل سے یہ یقین ناپید ہوتا جائے۔ جس دن (خدانکردہ) ایسا ہو گیا، پاکستان کی عمارت خود بخود نیچے آ گرے گی۔ اس لئے کہ جب وہ بنیاد ہی باقی نہیں رہے گی جس پر یہ عمارت استوار ہوئی تھی، تو اس کی دیواریں اور چھت خود اپنے بوجھ سے نیچے گر جائیں گی۔ آپ دیکھئے کہ نوجوانوں کے دل سے اس یقین کو کم اور ناپید کرنے کے لئے، یہاں (دانستہ اور نادانستہ) کیا کچھ ہو رہا ہے۔

مثلاً

(۱) اس یقین کو پیدا اور مستحکم کرنے کا بنیادی ذریعہ تعلیم تھا اور تعلیم ہی ہے (تشکیل پاکستان کے بعد سب سے مقدم ضرورت اس امر کی تھی کہ ہمارا نظام تعلیم ایسے خطوط پر متشکل کیا جاتے جن سے' اسلام کا وہ درخشندہ تصور جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، ہماری نئی نسل کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوتا چلا جائے۔ اہل پاکستان نے اس باب میں کچھ نہیں کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری نئی نسلوں کے دل میں اسلام کے لئے کسی شیفتگی اور وابستگی کا جذبہ موجود نہیں۔ تعلیم کے سلسلہ میں یہاں جو کچھ کیا گیا وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا کہ اسکولوں اور کالجوں میں "دینیات" کو لازم قرار دے دیا۔ اور دینیات کی تعلیم کے لئے یونیورسٹی میں الگ شعبہ کھول دیا۔ ہماری درسگاہوں میں دینیات کے نام سے جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، وہ نوجوان طالب علم کے دل میں، اسلام کی عظمت اور توقیر پیدا کرنے کے بجائے، اُسے اُلٹا اسلام سے متنفر کر دیتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جو انگریزوں کے زمانے میں اسلامیہ اسکولوں اور کالجوں کے طالب علموں کے ساتھ ہوتی تھی۔ اس زمانے میں گورنمنٹ کالج کا طالب علم، اسلام سے بیگانہ ہوتا تھا لیکن اسلامیہ کالج کا طالب علم دین سے متنفر ہو کر نکلتا تھا۔ اب یہی کچھ ہر اسکول اور کالج کے طالب علم کے ساتھ ہو رہا ہے۔

(۲) اسکولوں اور کالجوں میں یہ کچھ ہو رہا ہے۔ باہر کی فضا میں، ہمارے مذہب پرست طبقہ کی طرف سے جس قسم کا اسلام پیش کیا جاتا ہے وہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو اسلام کی طرف سے دھکے دے دے کر دور پھینکتا چلا جا رہا ہے۔ جمعہ اور عید کے خطبوں میں۔ میلاد اور وعظ کی محفلوں میں۔ آئے دن، مختلف عنوانات کے تحت، منعقد کردہ، مذہبی جلسوں میں۔ اخبارات اور رسائل میں۔ حتیٰ کہ ریڈیو پر نشر کردہ درس قرآن میں جو کچھ بیان ہوتا ہے، اس کے بعد نوجوانوں کو اسلام سے متنفر کرنے کے لئے کسی اور شے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

(۳) مذہب پرست طبقہ کی طرف سے، اسلامی حکومت کا جو نقشہ پیش کیا جاتا ہے، اس سے ان نوجوانوں کے دل میں، ایسی حکومت کی طرف سے بغاوت اور سرکشی کے جذبات شعلوں کی طرح بھڑک اٹھتے ہیں وہ نقشہ اس قسم کا ہوتا ہے کہ مملکت کا اقتدار اور اختیار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں ہوگا۔ (نوجوان طالب علم خوب جانتا ہے کہ جب اقتدار، مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں آجائے تو انسانیت پر کیا گزرا کرتی ہے)۔

اسلامی حکومت میں فکر و نظر کی آزادی سلب کرلی جائے گی۔ ہر شخص کو اسلام کے متعلق وہ تصورات اور نظریات رکھنے ہوں گے جنہیں مذہبی پیشوائیت صحیح تسلیم کرے گی۔ جو ان کے تصورات کے خلاف کوئی

عقیدہ رکھے گا، وہ مرتد قرار دیدیا جائے گا اور قتل کر دیا جائے گا۔

اسلامی حکومت میں، جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا جائے گا۔ ان لونڈیوں کو "استعمال" کیا جائے گا اور جب جی چاہے فروخت کر دیا جائے گا۔

اس مملکت میں، "اچھے مقاصد" کے حصول کے لئے، جھوٹ بولنے اور فریب دینے تک کی اجازت ہو گی — اجازت ہی نہیں، بلکہ بعض حالات میں، از روئے شریعت، ایسا کرنا واجب ہو گا۔ نیز اس کی پالیسی یہ ہو گی کہ دنیا میں بلند آہنگ اصولوں کا ڈھول لئے کرے، لیکن جب ان اصولوں پر عمل کرنے کا وقت آئے تو ان سے صاف پھر جائے۔ وغیرہ وغیرہ ان باتوں کا جو اثر نوجوان طالب علموں پر ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

(۴) ادھر یہ ہو رہا ہے، دوسری طرف کمیونسٹ اور ان کے دیگر ہم صفیر ان نوجوانوں کا اخلاق تباہ کرنے میں دن رات مصروف ہیں، اس کے لئے "ثقافتی پروگراموں" کی آڑ، ان کے لئے بڑی مستحکم پناہ گاہ ہے۔ حیاسوز ڈرامے۔ فحاشی پھیلانے والے ناچ اور گانے۔ جنسی جذبات مشتعل کرنے، اور جرائم کی ترغیب دینے والی فلمیں۔ عورتوں اور لڑکیوں میں نمائش حسن کے جذبات بیدار کرنے کی مختلف تدبیریں۔ شراب اور جوئے کو جزو تہذیب بنا کر عام کرنے والی کلبیں اور جیم خانے۔ جنسی لٹریچر اور عریاں تصویریں۔ ظاہر ہے کہ جب فضا ان انسانیت کش جرائم سے بھرپور ہو، تو نوجوانوں کے دلوں میں اسلام کی محبت کہاں سے آئے گی؟ محبت تو ایک طرف، وہ اسلام کے نام سے دور بھاگیں گے کیونکہ اس میں انہیں ان بے باکیوں پر پابندیاں عائد کرنی پڑیں گی۔

(۵) یہ کچھ کمیونسٹوں کی طرف سے ہو رہا ہے۔ دوسری طرف ہمارا مذہبی طبقہ، نوجوانوں کو کمیونزم کی طرف مار مار کر لئے جا رہا ہے۔ وہ یہ ثابت کرنے کے لئے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا رہا ہے کہ اسلام سرمایہ داروں کا مذہب ہے۔ یہ حضرات نہایت شد و مد سے اس قسم کے وعظ کہتے چلے جاتے ہیں کہ

> اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے، جائز چیزوں کی ملکیت، جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری۔ غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔
>
> ...... (اسی طرح) ملکیت زمین کے لئے رقبہ کی حد بندی اسلام کے مجموعی نظام میں کسی طرح ٹھیک نہیں بیٹھتی...... اسلام یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے

جو اس میں خود کاشت کرے..... اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں مگر جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔

(مسئلہ ملکیت زمین - سید ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۷۱)

آپ غور کیجئے کہ جب ان نوجوانوں کے سامنے یہ اسلام پیش کیا جائے گا جو عباسیوں کے دور ملوکیت اور سرمایہ پرستی میں وضع ہوا تھا، تو وہ اس سے بھاگ کر، کمیونزم کے آغوش میں کیوں نہیں چلے جائیں گے۔ اگر وہ علانیہ کمیونسٹ نہ بھی ہوں، تو بھی اسلام کی طرف سے ان کے دل میں محبت اور عقیدت کبھی پیدا نہیں ہو سکے گی۔

(۴) ان کے علاوہ، پاکستان میں وہ عنصر (یعنی جمعیت کی شکل میں) موجود ہے جنہیں، خود یا جن کے "بزرگوں" کو اقبالؒ نے نظریہ پاکستان کی مخالفت کی بناء پر سختی سے لتاڑا تھا۔ انہوں نے اقبالؒ کے خلاف باقاعدہ محاذ قائم کر رکھا ہے۔ ان میں بیشتر اہل قلم و لسان ہیں۔ وہ اٹھتے، بیٹھتے، عجیب عجیب انداز سے اقبالؒ کو ہدف طعن و تنقید بناتے رہتے ہیں جس کی تان اس پر ٹوٹتی ہے کہ وہ ایک شاعر تھا جو اپنے خوابوں کی دنیا میں مست رہتا تھا۔ اسے حقائق اور واقعات سے کیا تعلق؟ اس نے اپنی شاعرانہ ترنگ میں، قوم کو پاکستان کا تصور دے دیا، اور چونکہ قوم جذبات پرست واقع ہوئی تھی، اس لئے اس نے اسے حقیقت سمجھ کر اپنا لیا۔ اُدھر انگریز یہ چاہتا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مستقل جنگ ٹھنی رہے۔ اس کا سہل ترین طریقہ یہ تھا کہ ان کی دو الگ الگ مملکتیں قائم کر کے، خود، روایتی بندر کی طرح، ثالث بنا رہے، اس لئے پاکستان وجود میں آگیا اس کا نتیجہ وہی ہوا جو مولانا آزاد فرمایا کرتے تھے کہ پاکستان بن جانے سے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کہ ہندوستان سے مسلمان ختم ہو جائے گا اور پاکستان سے اسلام!

یہ "ناصحین مشفق" نہایت دلدوزی اور جگر سوزی کے ساتھ ان مواعظ حسنہ کو دہراتے رہتے ہیں۔ باقی رہے قائداعظمؒ۔ سو ان کے متعلق ان حضرات کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ گاندھی جی کے مقابلہ میں آل انڈیا لیڈرشپ چاہتے تھے۔ اور اس کی، اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی کہ مسلمانوں کو ایک الگ قوم قرار دے کر اس کی مسند امامت پر خود براجمان ہو جائیں۔

یہ ہیں نظریہ پاکستان کے متعلق وہ آوازیں جو قوم کے نوجوانوں کے کان میں، صبح شام پڑتی رہتی ہیں۔ اس کے برعکس، مملکت پاکستان کی طرف سے آج تک تحریک پاکستان کی کوئی مستند تاریخ اور سرگزشت شائع نہیں ہوئی جس سے نئی نسلوں کے نوجوان یہ سمجھ سکیں کہ اس تحریک کا پس منظر کیا تھا اور اس کا ہماری حیات ملی سے کس قدر گہرا تعلق ہے۔

(۵) ان تمام تخریبی عناصر کے علاوہ، جو خود مسلمانوں پر مشتمل ہیں، ایک اور عنصر بھی ہے جو نظریۂ پاکستان کی مخالفت کے سلسلہ میں مذکورہ بالا عناصر سے کہیں زیادہ مؤثر اور کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ سرسیدؒ کے زمانے میں، مسلمانوں کو اسلام کی طرف سے متنفر یا کم از کم بدظن کرنے میں عیسائی مشنری سب سے پیش پیش تھے۔ بعینہٖ وہی کیفیت اب پاکستان میں ہے۔ انگریز یہاں سے چلا گیا لیکن عیسائی مشنریوں کے اسکولوں اور کالجوں کا جال، ملک کے طول و عرض میں بکھرا پڑا ہے۔ اور چونکہ دنیا کی بڑی بڑی دولتمند قومیں ان کی پشت پر ہیں، اور یہ لوگ مشنری اسپرٹ کے ساتھ کام کرتے ہیں، اس لئے ان کی درسگاہوں کی شہرت، ہماری درسگاہوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ نتیجہ یہ کہ قوم کے بہترین بچے اور بچیاں ان کے اسکولوں اور کالجوں میں داخل ہونے کے لئے مضطرب رہتے ہیں، اور ان میں سے جسے داخلہ مل جاتا ہے وہ یوں خیال کرتا ہے گویا اسے جنت کا ٹکٹ مل گیا۔ یہ درسگاہیں مسلمان بچوں اور نوجوانوں کو، نظریۂ پاکستان سے برگشتہ کرنے کے منظم اڈے ہیں۔ ان میں بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں طریق اثراندازی اختیار کئے جاتے ہیں، بالواسطہ یوں کہ ان کے دلوں میں اسلام کے متعلق شکوک و شبہات کے ایسے بیج بوئے جاتے ہیں جو مرورِ زمانہ سے، رفتہ رفتہ تنومند درخت بن جاتے ہیں۔ قوم نے ان شکوک کے ازالہ کے لئے آج تک کوئی تدبیر اختیار نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ قوم کو اس خطرہ کا احساس ہی نہیں۔ جو لوگ اپنے بچوں کو ان درسگاہوں میں داخل کرانے کے لئے سفارشیں ڈھونڈتے رہے ہوں، وہ ان میں دی جانے والی تعلیم کے متعلق بدظن کیسے ہو سکتے ہیں؟ دوسری طرف قوم نے کوئی لٹریچر ایسا پیدا نہیں کیا جو ان نوجوانوں کے سینے کے اندر جھانک کر، ان کی ذہنی سطح کے مطابق، ان کے شکوک کا ازالہ کر سکے۔ مذہبی طبقہ کی طرف سے جس قسم کا لٹریچر شائع کیا جا رہا ہے، اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ان کے علاوہ، ملک میں متعدد ادارے "اسلام" کا لیبل لگائے، مختلف اقسام کی "ریسرچ" میں مصروف ہیں، اور ان پر قوم کی بے شمار دولت صرف ہو رہی ہے۔ ان کے ہاں بھی دیکھئے تو ایک کتاب ایسی نہیں ملے گی جو ان نوجوانوں کو بتا سکے کہ حقیقی اسلام کیا ہے اور ان کے شکوک کا حل کیا؛

یہ تو رہا، ان عیسائی درسگاہوں میں نظریۂ پاکستان کے خلاف بالواسطہ اثراندازی کا طریق۔ ان میں بلاواسطہ اثراندازی کی کیفیت یہ ہے کہ پہلے نہایت مشفقانہ انداز میں پاکستانی نظم و نسق اور یہاں کے اربابِ بست و کشاد کی سیرت و کردار کی برائیاں گنائی جاتی ہیں، اور اس کے بعد ایک ٹھنڈی سانس لے کر بعد حسرت کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ سب نتیجہ ہے ملک کی تقسیم کا۔ ہندوستان سے الگ ہونا مسلمانوں کی بہت بڑی غلطی تھی؛

گذشتہ پندرہ سال سے، ہم ہرسال، ہزاروں کی تعداد میں، اپنے سادہ لوح، معصوم بچے ان درسگاہوں میں بھیجتے چلے جا رہے ہیں، اور پندرہ سولہ برس کے بعد، وہاں سے ہرسال یہی بچے ہزاروں کی تعداد میں، اسلام کے خلاف نفرت اور تعصب اور پاکستان کے خلاف سرکشی اور بغاوت کے جذبات لئے، قوم میں شامل ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ہم بہت خوش اور مطمئن ہیں کہ ان درسگاہوں میں تعلیم کا انتظام بہت اچھا ہے۔ بلکہ ہم ان لوگوں کے احسانمند ہیں کہ انہوں نے یہاں یہ درسگاہیں قائم کر رکھی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتیں تو ہمارا کیا بنتا؟

درسگاہوں میں یہ کچھ ہو رہا ہے، اور باہر، عیسائی مشنری، منظم طریق سے، لوگوں کو عیسائی بنانے میں مصروف ہیں۔ ان لوگوں کو، مذہب عیسائیت کی حقانیت کا قائل کر کے عیسائی نہیں بنایا جاتا۔ عیسائیت کی حقانیت کے قائل تو اب خود عیسائی بھی نہیں رہے۔ انہیں محض معاشی ترغیبات سے عیسائی بنایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ "تبلیغ"، ملک کے پس ماندہ اور غریب طبقہ میں عام کی جاتی ہے۔ عیسائیت کے اس طرح پھیلنے میں خود ہمارے ہاں کے افسران بھی مدد کر رہے ہیں۔ غریب (مسلمان) دیہاتی اپنی چھوٹی چھوٹی مشکلات کے لئے مہینوں بلکہ برسوں تک دربدر مارے مارے پھرتے رہتے ہیں اور ان کی کہیں شنوائی نہیں ہوتی۔ ایک پادری جاتا ہے اور اپنی مسیحی جماعت کے لئے ان مشکلات کا حل ایک دن میں کرا لاتا ہے۔ یہ چیز بجائے خویش لوگوں کو اس جماعت میں شامل ہونے کے لئے بڑی ترغیب دیتی ہے۔ بہرحال مختلف طریقوں سے یہاں عیسائیت پھیلائی جا رہی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ یوں عیسائی ہو رہے ہیں، عیسائیت کی حقانیت کے قائل ہوں یا نہ، اسلام کی افضلیت اور صداقت کے تو بہرنوع منکر ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کی موجودہ نسلوں کی حالت ہے۔ اس کے بعد ان کی آنے والی نسلیں، پیدائشی عیسائی ہوں گی، اور چونکہ مشنریوں کے ہاں ان کی تعلیم کا خاص طور پر انتظام موجود ہے، اس لئے وہ اپنے عقائد میں پختہ تر ہوتی جائیں گی۔ اس باب میں ہم عیسائی مشنریوں اور اداروں کو مورد الزام نہیں ٹھہراتے۔ یہ ان کی زندگی کا مشن ہے۔ اس کے لئے انہیں جو زمین بھی سازگار نظر آئے گی، وہ اسے اس میں پھیلائیں گے۔ ڈوب مرنے کا مقام تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی مملکت میں، مسلمانوں کے لئے، مسلمانوں کے معاشرہ کے مقابلہ میں غیر مسلموں کا معاشرہ زیادہ جاذب بن جائے۔ اس میں دوسروں کا کیا قصور ہے! لیکن قصور کسی کا بھی ہو، یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ اس سے ملک کی آبادی کا ایک خاصہ حصہ نظریۂ پاکستان سے دور ــــ بہت دور ــــ ہٹتا جا رہا ہے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ عوامل جو، ہمارے نزدیک، ملک میں نظریۂ پاکستان کی گرفت کو کمزور سے کمزور تر کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی مملکت کی بنیاد آئیڈیالوجی پر ہو، تو جوں جوں اُس آئیڈیالوجی

کی گرفت ڈھیلی پڑتی جائے گی، مملکت کمزور ہوتی جائے گی۔ مملکت پاکستان کے مستقبل کے سلسلہ میں یہ بڑا اہم سوال ہے، لیکن، بہت کم لوگ ہیں جنہیں اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کرنا کیا چاہیئے؟ اس سوال کا جواب، خود تصریحات بالا میں موجود ہے بنیادی ضرورت اس کی ہے کہ پاکستان کی آئیڈیالوجی پر یقین کو، محکم سے محکم تر کیا جائے۔ لیکن یہ یقین صرف اس صورت میں محکم ہو سکتا ہے کہ اسلام کی صداقت، اور تمام نظامہائے عالم کے مقابلہ میں اس کی افضلیت اور فوقیت، کو اس طرح واضح اور ثابت کیا جائے کہ وہ دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کا ذریعہ دینی تعلیم کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن دینی تعلیم وہ نہیں جو ہمارے مذہبی مکاتب اور دارالعلوموں میں دی جاتی ہے۔ یہ تعلیم کسی زمانہ میں مفید ہوگی۔ لیکن آج یہ اس مقصد کو قطعاً پورا نہیں کر سکتی۔ آج حالت یہ ہے کہ ہمارے ہاں کا بڑے سے بڑا عالم، کالج کے طلباء کے دل میں پیدا ہونے والے، شکوک و شبہات کا ازالہ کبھی نہیں کر سکتا۔ وہ ان کے اعتراضات کا اطمینان بخش جواب نہیں دے سکتا۔ اس میں وہ "دینیات کے پروفیسر" بھی شامل ہیں جو یونیورسٹیوں سے "دینیات" کی ڈگری لے کر نکلتے ہیں — ہمارے پیش نظر کسی کی تنقیص و تنقید نہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ چیز ان حضرات کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے کہ جو تعلیم ان دارالعلوموں یا کالجوں میں دی جاتی ہے، خود اس کے سامنے یہ مقصد نہیں۔ یہ مقصد صرف قرآن کی تعلیم سے حاصل ہو سکتا ہے ہمارے نزدیک اس سلسلہ میں کرنے کا کام یہ ہے کہ اس وقت "اسلامک ریسرچ" کے نام سے مختلف اداروں میں جو بے مقصد کام ہو رہا ہے، اسے ایک طرف رکھ دیا جائے، اور ایک منتخب ادارہ قائم کر کے، اس کے ذمے یہ کام لگا دیا جائے کہ وہ دورِ حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھے اور اس کے بعد اس امر کی تحقیق کرے کہ قرآن کریم ان تقاضوں (CHALLENGES) کا مقابلہ کس طرح سے کرتا ہے اور انسانوں کے خود ساختہ نظامہائے معاشرت و معیشت کے ہاتھوں اس وقت دنیا جس جہنم میں مبتلا ہے، وہ اس سے نکلنے کا طریق کیا بتاتا ہے۔ وہ اپنی اس تحقیق کی روشنی میں ایسا لٹریچر مرتب کرے جو عصرِ حاضر کی بلند ترین علمی سطح پر قرآنی نظامِ زندگی کی افضلیت اور فوقیت کو علیٰ وجہ البصیرت ثابت کر دے۔ اور جوں جوں انسانی علوم ترقی کرتے جائیں، ان کی تحقیق، کی سطح بھی بلند ہوتی جائے۔

قرآنی حقائق و اصولِ حیات کی تحقیق کے ساتھ سیرت نبی اکرمؐ سے متعلق ایسا لٹریچر مرتب کیا جائے جس سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آ جائے کہ حضورؐ نے زندگی کے ہر معاملہ میں کتنے عظیم کردار اور بلند ترین کیریکٹر کا مظاہرہ فرمایا تھا۔ یہی حضورؐ کا وہ اسوۂ حسنہ ہے جس کے اتباع سے ایک فرد، اور قوم صحیح معنوں میں معیارِ انسانیت پر

پوری اتر سکتی ہے۔

یہ لٹریچر ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں بطور نصاب تعلیم داخل ہو' اور اس کے ساتھ ہی لسے ملک میں اس طرح پھیلا دیا جائے کہ یہ ہر پڑھے لکھے کے ہاتھوں تک پہنچ جائے یہی اخبارات اور رسائل میں پھیلے اور اسی کو ریڈیو پر نشر کیا جائے۔ غرضیکہ دور حاضرہ نے تبلیغ کے جس قدر اسباب و وسائل مہیا کئے ہیں' انہیں اس لٹریچر کے عام کرنے میں استعمال کیا جائے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی اشد ضروری ہے کہ ملک کے معاشی نظام کو قرآنی خطوط پر متشکل کیا جائے اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نے مغرب کے گھسے پٹے معاشی نظام کو اپنا قالب (PATTERN) قرار دے رکھا ہے جو ہماری مشکلات میں روز بروز اضافہ کئے جا رہا ہے۔ جو طبقہ اس سے بیزار ہو جاتا ہے' اس کی نگاہیں روس پر جا کر ٹکتی ہیں' جہاں انسانیت پہلے ہی زار زار رو رہی ہے۔ قائد اعظمؒ نے اپنی آخری تقریر میں' جو انہوں نے یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو' اسٹیٹ بنک کا افتتاح کرتے ہوئے کراچی میں کی تھی' فرمایا تھا۔

> ہمارے پیش نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوش حال اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں اس مقصد کا حصول' مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیئے اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا چاہیئے جو انسانی مساوات اور عدل عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ یہی وہ طریق ہے جس سے ہم اس اہم فریضہ سے عہدہ برا ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے۔ اور ہم دنیا کو وہ پیغام امن دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچا لیگا۔ اور نوع انسان کی بہبود' مسرت اور خوش حالی کا ضامن ہو سکے گا۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکے گا۔

قائد اعظمؒ نے یہ بات آج سے چودہ سال پہلے کہی تھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا قائد اعظمؒ کے نقوش قدم پر چلنے کی مدعی مملکت پاکستان نے' اس نظام کو عملاً متشکل کرنا تو ایک طرف یہ متعین کرنے کی بھی زحمت اٹھائی ہے کہ وہ نظام ہے کیا جس کی طرف قائد اعظمؒ نے اشارہ کیا تھا؟ یہ وہ نظام ہے جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۷ء میں قائد اعظمؒ کی توجہ ان الفاظ میں مبذول کرائی تھی کہ

> اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامان پرورش

(SUBSISTENCE) ضرور مل جاتا ہے۔ (ہندوؤں کے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں)۔

اگر ہندوؤں نے اشتراکی جمہوریت (SOCIAL DEMOCRACY) کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے نہ ٹکرائے، اسلام میں کسی تبدیلی کے مرادف نہیں۔ بلکہ اس سے مفہوم یہ ہو گا کہ ہم اسلام کو پھر سے اس منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا وہ شروع میں تھا۔

پاکستان میں نوے فیصد سے بھی زیادہ آبادی غریب ہے۔ ان کے نزدیک، پاکستان کی آئیڈیالوجی کے بہترین ہونے کی دلیل وہ نظام ہی ہو سکتا ہے جو ان کی ضروریات زندگی کا کفیل ہو سکے۔ اگر یہاں ایسا نظام قائم ہو گیا تو اس آئیڈیالوجی سے ان کی وابستگی رہے گی، ورنہ یہ اس سے بے تعلق ہو جائیں گے۔ یہی وہ بنیادی حقیقت تھی جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے قائد اعظمؒ کی توجہ ۱۹۳۷ء میں دلائی تھی جب کہا تھا کہ

روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گزشتہ دو سو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہو؟ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک بے تعلق رہے ہیں۔

جس طرح اس وقت لیگ کے مستقبل کا انحصار اسی (معاشی) مسئلہ پر تھا، اسی طرح اب پاکستان کے مستقبل کا مدار اسی مسئلہ کے حل پر ہے۔ اس کا حل قرآن کے معاشی نظام کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔ یہی وہ نظام ہے جس میں مملکت تمام افراد کی بنیادی ضروریات زندگی کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتی ہے۔ اور یہ وہ ذمہ داری ہے جسے نہ اسلام سے پہلے کسی نظام نے اپنے اوپر لیا نہ اس کے بعد یہ قرآن کے معاشی نظام کی انفرادیت ہے۔

یہ ہے ہمارے نزدیک اس مسئلہ کا حل۔ جب تک یہ تدابیر اختیار نہیں کی جائیں گی، پاکستان کے استحکام کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکے گی۔

چونکہ بات ذرا لمبی ہو گئی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند الفاظ میں اس کا خلاصہ پیش کر دیا جائے۔ ہم نے کہا یہ ہے کہ

(۱) نظریۂ پاکستان، مغرب کے تصورِ قومیت کے خلاف، ایک بالکل نیا تصور تھا (جسے اسلام نے دنیا کے سامنے چودہ سو سال پہلے پیش کیا تھا)۔

(۲) اس نظریہ کی بنیاد اس ایمان پر ہے کہ

(ا) قومیت کی تشکیل، اشتراکِ وطن کے بجائے، آئیڈیالوجی کے اشتراک پر ہوتی ہے۔

(ب) اس آئیڈیالوجی سے مفہوم یہ ہے کہ اسلام ہی وہ واحد مکمل نظامِ زندگی ہے جو انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچا سکتا ہے، اور ان مصیبتوں کا حل دے سکتا ہے جن میں اقوامِ عالم اس وقت بری طرح مبتلا ہیں۔ اس لئے اسلام سے بلند تو ایک طرف، اس کی مثیل و نظیر بھی کوئی نظام نہیں ہو سکتا ہے۔

(۳) تحریکِ پاکستان کے دوران میں اس نظریہ کی سخت مخالفت ہوئی۔ اور یہ مخالفت، انگریز اور ہندو کے علاوہ، خود مسلمانوں کی طرف سے ہوئی۔

(۴) تشکیلِ پاکستان کے بعد یہ مخالفت بدستور جاری ہے۔ ان مخالفین کا طریق کار یہ ہے کہ قوم کی جدید نسلوں کے دل میں اسلام کے متعلق شکوک و شبہات پیدا کر دیئے جائیں اور اس طرح اس آئیڈیالوجی پر یقین کو کمزور سے کمزور تر کرتے جائیں جس پر پاکستان کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

(۵) اس مخالفت میں، ایک طرف، لادین (بالخصوص کمیونسٹ خیالات کا حامی) طبقہ، مختلف "ثقافتی سرگرمیوں" کے نقاب میں، نوجوانوں میں فکر و نظر کی آوارگی پیدا کر رہا ہے، اور دوسری طرف، ہمارا قدامت پرست مذہبی طبقہ اس قسم کا اسلام پیش کرتا ہے جو نہ صرف یہ کہ ان نوجوانوں کے شکوک و شبہات کا ازالہ کر سکنے کے قابل نہیں بلکہ انہیں الٹا اسلام سے متنفر اور سرکش بنائے چلا جا رہا ہے۔

(۶) عیسائی مشنریاں مسلمانوں کو، اسلام سے متنفر اور برگشتہ کرنے کے سلسلہ میں دن رات مصروفِ تگ و تاز ہیں۔

(۷) اس کا علاج یہ ہے کہ ایک ایسا تحقیقاتی ادارہ قائم کیا جائے جو پہلے یہ دیکھے کہ ہمارے زمانے کے تقاضے کیا ہیں اور ہمارے نوجوانوں کی ذہنی مشکلات کیا۔ اس کے بعد وہ بتائے کہ قرآن کریم ان تقاضوں کا مقابلہ کس طرح کرتا ہے اور ان مشکلات کا حل کیا بتاتا ہے۔ اس طرح یہ ادارہ قرآن اور سیرتِ اقدس پر مشتمل ایسا لٹریچر مرتب کرے جو ہماری درسگاہوں میں بطور نصاب داخل کیا جائے اور جس کی ملک میں عام اشاعت ہو۔

(۸) اس کے ساتھ ہی ملک میں وہ قرآنی نظامِ معیشت رائج کیا جائے جس کی رو سے مملکت کا کوئی فرد بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔

(باقی صفحہ ۲۸ پر دیکھئے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

اسلام نام ہے اس طریق یا نظام کا جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کو اس دنیا کی سرفرازیاں اور خوشگواریاں بھی حاصل ہو جاتی ہیں اور وہ مرنے کے بعد زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل بھی ہو جاتا ہے۔ یہ طریقِ زندگی تمام نوعِ انسان کیلئے خدا کی طرف سے تجویز کردہ ہے اور ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رہنے کیلئے دیا گیا ہے۔ نہ اسلام کے سوا کوئی اور طریقِ زندگی اس عظیم مقصد کو پورا کر سکتا ہے اور نہ ہی اس میں کسی تغیر و تبدل یا حک و اضافہ کی ضرورت لاحق ہو سکتی ہے۔ یہ انسانیت کے لئے خدا کی طرف سے مکمل اور آخری نظامِ حیات ہے۔ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور طریقِ زندگی اختیار کرے گا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا ۳/۸۵) سے یہی مراد ہے۔

نبی اکرمؐ نے اسی اسلام کی دعوت تمام نوعِ انسان کو دی یعنی یہ دین نہ قومی تھا نہ خاندانی۔ نہ نسلی تھا نہ وطنی بلکہ ان کی دعوت خون، نسل، رنگ، قوم، زبان، وطن کی حدود و قیود سے ماوراء پوری کی پوری نوعِ انسان کے لئے تھی۔

تمام نوعِ انسان کی طرف رسول

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (۷/۱۵۸) "تم پوری نوعِ انسان سے پکار کر کہہ دو کہ میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں"۔ یہ دعوت نہایت حکیمانہ اور حسن کارانہ انداز سے دی جاتی تھی اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (۱۶/۱۲۵) اور علم و بصیرت اور دلائل و براہین پر مبنی ہوتی تھی۔ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (۱۲/۱۰۸) جو لوگ اس طرح دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ اس دعوت کو قبول کر لیتے تھے، وہ اس جماعت کے افراد بن جاتے تھے جو اپنی

زندگی اسلام کے مطابق بسر کرنے کے لئے وجود میں آئی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب اسلام ایک نظامِ زندگی کا نام ہے، تو جو لوگ (جماعت مومنین) اس نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے تھے ان پر کچھ پابندیاں عائد ہوتی تھیں ۔۔۔ یعنی یہ کہ انہیں فلاں فلاں کام ضروری کرنے ہیں اور فلاں فلاں باتوں سے رکنا اور بچنا ہے۔ ان لوگوں کے لئے جن امور کا سر انجام دینا ضروری تھا، قرآن کریم نے انہیں "معروف" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے ۔۔۔ یعنی وہ باتیں جنہیں وہ نظام صحیح تسلیم (RECOGNISE) کرتا ہے ۔۔۔ اور جن باتوں سے بچنا ضروری تھا، وہ انہیں "منکر" کہہ کر پکارتا ہے ۔۔۔ یعنی ایسی باتیں جو اس نظام کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔

معروف منکر

نظام کے تابع زندگی بسر کرنے کا عملی مفہوم یہ ہے کہ اس بات کو افراد کی مرضی پر نہیں چھوڑ دیا جاتا کہ وہ جس طرح جی چاہے "معروف" پر عمل کریں اور "منکر" سے رکیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے متعین کیا جائے کہ "معروف" کیا ہے اور "منکر" کیا۔ اور "معروف" پر عمل کرنے کی شکل کیا ہوگی اور "منکر" سے رکنے کا طریق کیا۔ بالفاظ دیگر یہ کچھ نظم و ضبط کے تابع ہوگا۔ اس نظم و ضبط کو، دورِ حاضر کی اصطلاح میں نظامِ مملکت کہتے ہیں۔ لہٰذا دین اس نظامِ مملکت کا نام ہے جس میں افرادِ مملکت کو اسلام کے مطابق چلایا جاتا ہے۔ یعنی انہیں "معروف" کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اور "منکر" سے روکا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس کے لئے "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے دو تین باتوں کا دہرا لینا ضروری ہے جو تصریحات بالا سے مستنبط ہوتی ہیں یعنی۔

(۱) اسلام کی طرف دعوت تمام نوعِ انسان کو دی جائے گی۔ یہ صرف "دعوت" ہوگی جبر نہیں ہوگا۔ بالفاظ دیگر اسلام کو لوگوں تک پہنچا دیا جائے گا۔ اور اسے ان کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ چاہے اسے اختیار کرلیں، چاہے اس سے انکار کردیں۔

(۲) جو لوگ بطیبِ خاطر دل اور دماغ کی پوری رضامندی کے ساتھ اس دعوت کو حق سمجھ کر اختیار کرلیں گے وہ جماعت مومنین کے افراد بن جائیں گے۔

(۳) یہ جماعت، ایک نظامِ مملکت کے تابع زندگی بسر کرے گی، جو انہیں "معروف" کے مطابق چلنے اور "منکر" سے رکنے کے لئے ضروری احکام نافذ کرے گا۔

نظم و ضبط

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ ان احکام سے یہ مطلب نہیں کہ وہ نظامِ مملکت افراد کی زندگی کو قدم قدم پر قانون کی زنجیروں میں جکڑ دے گا چونکہ یہ جماعت وہ ہوگی جس نے

اچھی طرح سے سمجھ سوچ کر، قلب اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ اس طریقِ زندگی کو اختیار کیا ہوگا، اس لئے معروف کے اتباع اور منکر سے اجتناب کا جذبہ ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھریگا حتیٰ کہ رفتہ رفتہ ان کی کیفیت یہ ہو جائے گی کہ ان کا ہر قدم، بلا تکلف و بلا تامل، از خود، معروف کے مطابق اٹھے گا اور منکر سے رکے گا۔ اس طریقِ زندگی کا منتہیٰ و مقصود یہی یہ ہے کہ وہ انسانی سیرت و کردار کو اس سانچے میں ڈھال دے جسے خدا نے انسانوں کے لئے تجویز کیا ہے۔ یہ مقصد صحیح تعلیم و تربیت سے حاصل ہوتا ہے جو اس مملکت کا بنیادی فریضہ ہوتا ہے۔ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" درحقیقت، معاشرہ میں نظم و ضبط کے لئے ہوگا۔

اب آگے بڑھئے

حضورؐ کا فریضہ

جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، نبی اکرمؐ کا ایک فریضہ یہ تھا کہ نوعِ انسان کو اسلام کی دعوت دی جائے۔ اس اعتبار سے حضورؐ "داعی الی اللہ" (۳۳/۴۶) اور داعیِ تبلیغ اسلام تھے (۵/۶۷)، لیکن اس کے ساتھ ہی حضورؐ کا فریضہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" بھی تھا۔۔۔۔۔ یَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ پہلا فریضہ عام انسانوں (غیر مسلموں) کو اسلام کی دعوت دینے کا تھا۔ دوسرا فریضہ اسلامی مملکت میں معروف کو عملاً نافذ کرنے اور منکر سے عملاً روکنے کا۔

نبی اکرمؐ کے بعد یہ دونوں فرائض امت کی طرف منتقل ہو گئے یعنی غیر مسلموں کو اسلام کی طرف دعوت دینا، اور اسلامی مملکت میں "امر بالمعروف و نہی عن المنکر"۔ چونکہ اس وقت ہمارے پیشِ نظر موضوع ۔۔۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ۔۔۔ ہے، اس لئے ہم سرِدست پہلے فریضہ (تبلیغ و دعوت) کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے)۔ اس

امت کا فریضہ

فریضہ کے متعلق کہا گیا۔ اَلَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ۔ (۲۲/۴۱)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں حکومت ملے گی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے۔ معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔ اور ان کے تمام کام، انجام کار، اللہ کے لئے ہوں گے۔

اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ۔

(۱) اقامتِ صلوٰۃ۔

(۲) ایتائے زکوٰۃ۔

(۳) امر بالمعروف۔ اور

(۴) نہی عن المنکر۔

ہو گا۔ اس وقت ہم اس بحث میں نہیں جانا چاہتے کہ قرآن کریم کی رو سے "اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کیلئے بھی تمکن فی الارض (اسلامی حکومت) ضروری ہے۔ اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اور چونکہ اسلامی حکومت پوری کی پوری امت کی ہوتی ہے (وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ۔ ان کی حکومت باہمی مشاورت سے ہوتی ہے) نہ کسی خاص فرد یا گروہ کی، اس لئے اس فریضہ کو پوری امت ادا کرتی ہے۔ ان کی کوئی خاص جماعت نہیں چنانچہ قرآن کریم نے دیگر مقامات پر اس کی واضح الفاظ میں تصریح کر دی ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔ (۳/۱۰۹)

تم ایک بہترین قوم ہو جسے تمام نوع انسان کی بھلائی کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو۔ اس لئے کہ تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس سے واضح ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ پوری کی پوری امت کا ہے۔ سورہ توبہ میں ہے وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ...... (۹/۷۱)۔ مومن مرد اور مومن عورتیں، ایک دوسرے کے رفیق اور مددگار ہیں۔ یہ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔ اس سے بھی واضح ہے کہ یہ فریضہ پوری امت کا ہے۔ کسی خاص گروہ کا نہیں حتیٰ کہ اس میں مومن عورتیں بھی، مردوں کے ساتھ برابر کی شریک ہیں۔ اس سورہ میں ذرا آگے چل کر عام مومنین کی صفات بیان کی گئی ہیں اور اس ضمن میں کہا گیا ہے۔ اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (۹/۱۱۲) "وہ معروف کا حکم دینے والے اور منکر سے روکنے والے ہیں"۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ

(۱) امر بالمعروف و نہی عن المنکر تمام امت مسلمہ کا فریضہ ہے۔

(۲) یہ امت اس فریضہ کو حکومت کے ذریعے سر انجام دیتی ہے۔ حکم (امر) ایک حکومت ہی دے سکتی ہے اور حکومت ہی کسی کو غلط باتوں سے روک سکتی ہے۔ "روکنے" کے لئے قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

اسلام کے قرن اول میں جب دین اپنی حقیقی شکل میں قائم تھا، اسلامی حکومت اس فریضہ کو انجام دیتی

قرنِ اول میں

تھی، اور چونکہ یہ حکومت ساری امت کی صحیح نمائندہ ہوتی تھی اس لئے درحقیقت خود امت اس فریضہ کو سرانجام دیتی تھی۔ نہ اس کے لئے کوئی الگ جماعت تھی۔ اور نہ ہی غیر مسلموں تک اسلام پہنچانے (تبلیغ) کے لئے کوئی خاص گروہ۔ یہ فریضہ بھی ہر مسلمان سرانجام دیتا تھا۔ اور اس کے لئے اس کے پاس سب سے زیادہ موثر ذریعہ خود اس کی سیرت و کردار تھا۔ غیر مسلموں کے ساتھ اس کا حسنِ معاملہ اس کے دین کی صداقت کی محکم دلیل اور زندہ شہادت تھی۔ اس زمانے میں امت میں کوئی گروہ ایسا نہیں تھا جس کے ذمے "امورِ مذہبی" کی سرانجام دہی ہو۔ اس وقت امت "مذہب" کے لفظ تک سے آشنا نہیں تھی۔ ان کے پاس دین تھا جس میں مذہبی اور سیاسی امور کی تفریق ہی نہیں ہوتی۔

اس کے بعد جب، ہمارے ہاں (دین کا نظام گم ہو جانے سے) مذہب اور سیاست کی ثنویت عمل میں آئی تو امورِ مملکت، حکمران طبقہ نے اپنی تفویض میں لے لئے اور مذہبی امور کے لئے ایک الگ گروہ وجود میں آ گیا۔ چونکہ ان کے پاس حکومت کا اقتدار نہیں تھا اس لئے ان کے نزدیک "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کا مفہوم اتنا ہی رہ گیا کہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کے ذریعے اچھے کام کرنے کی تلقین کی جائے اور برے کاموں سے بچنے کی تاکید۔ اس طرح ایک طرف حکومت، ایک خاص طبقہ کی ملکیت بن گئی اور دوسری طرف "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کا واعظانہ فریضہ بھی ایک خاص گروہ کے اندر محدود ہو گیا۔ امت نہ اس میں شریک رہی، نہ اس میں۔ ایوانِ حکومت میں حکمران طبقہ اپنے آپ کو "ہم" اور امت کو "تم" کہہ کر پکارتا تھا اور مسجد میں واعظ اور خطیب یہی کچھ کرتا تھا یعنی امت الگ تھی اور یہ دونوں گروہ الگ، اور امت سے بالا۔ یہی کیفیت آج تک چلی آ رہی ہے کیونکہ اس کے بعد دین کا نظام (جسے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کہا جاتا ہے) پھر قائم نہیں ہوا۔

یہاں تک بات بالکل واضح اور صاف ہے لیکن حیرت اس وقت ہوتی ہے جب یہ دیکھا جائے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے ایک الگ گروہ کے جواز بلکہ وجوب کے لئے خود قرآن کریم کی ہی ایک آیت سے سند پیش کی جاتی ہے۔ وہ سورۂ آلِ عمران کی حسبِ ذیل آیت ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (3/104)

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔

اور چاہیئے کہ تم میں ایک ایسی جماعت رہے جو نیک کاموں کی طرف بلاتی رہے اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کرے برائی سے۔ یہی لوگ اپنی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔

قرآن کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کہیں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس حقیقت کو اس نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل بتایا ہے۔ آپ ان تمام آیات پر ایک دفعہ پھر نگاہ ڈالیے جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو پوری کی پوری امت کا فریضہ بتایا ہے۔ (اور جنہیں پہلے درج کیا گیا ہے)۔ اور اس کے بعد سوچئے کہ اگر اس آیت (۳/۱۰۳) کا یہی مطلب لیا جائے (کہ یہ فریضہ پوری امت کا نہیں بلکہ امت کے ایک خاص گروہ کا ہے)۔ تو اس سے بڑی اختلافی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ یعنی ایک طرف تو قرآن بار بار کہتا ہے کہ یہ فریضہ پوری امت کا ہے اور ایک آیت میں یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ فریضہ پوری امت کا نہیں، امت کے ایک خاص گروہ کا ہے! قرآن کریم کے دیگر مقامات کو چھوڑیئے اسی سورۂ آل عمران کے اسی رکوع میں جس میں آیت (۳/۱۰۳) آئی ہے، پانچ آیتوں کے بعد وہ آیت موجود ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ... (۳/۱۰۹)

تم بہترین امت ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو۔

کیا آپ اس کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ قرآن کریم پہلے یہ حکم دیتا ہو کہ تم میں ایک گروہ ایسا رہنا چاہیے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ اور پھر پانچ ہی آیات بعد یہ کہے کہ نہیں! یہ فریضہ تم میں سے کسی ایک گروہ کا نہیں۔ ساری کی ساری امت کا ہے۔ اور پھر متعدد مقامات پر اس دوسری آیت کی تائید کرتا جائے، یہ ہو نہیں سکتا۔ پہلی آیت (۳/۱۰۳) کا مطلب دیگر آیات کے مطابق ہی ہونا چاہیے۔ اور وہ ان کے مطابق ہی ہے۔ اس میں غلط فہمی "مِنْكُمْ" سے پیدا ہوتی ہے (مِنْ + كُمْ) جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ تم میں سے۔ اس کا یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ عربی زبان میں (مِنْ) "میں سے" کے معنوں میں بھی آتا ہے (اسے تبعیض کہتے ہیں یعنی کل میں سے بعض)۔ جیسے قرآن کریم میں ہے۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۘ مِّنْهُم مَّن كَلَّمَ اللَّهُ...... (۲/۲۵۳) یہ وہ رسول ہیں جنہیں ہم نے بعض سے بعض پر فضیلت دی ہے۔ ان میں وہ بھی ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا یعنی ان میں سے بعض کی یہ خصوصیت تھی۔ یہ تبعیض کی مثال ہے۔

لیکن یہی "مِنْ" پوری کی پوری جنس کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ (اسے تبیین کہتے ہیں)[۵]۔ جیسے سورۂ بقرہ میں ہے وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ (۲/۲۳۱)۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ نے کتاب و حکمت میں سے جو نازل کیا ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے (الاتقان میں) اس کی اور مثالیں بھی دی ہیں۔ مثلاً

---

[۵] دیکھئے لغات القرآن۔ باب "من"

یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ (۳۱ : ۱۸) ۔ اس کے معنی "سونے کے کڑے" ہیں ۔ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے الہلال میں اس موضوع پر عمدہ بحث کی تھی جسے ہم درج ذیل کرتے ہیں ۔ انھوں نے "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے عنوان سے متعدد اشاعتوں میں ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا ۔ وہ اس میں اس خاص نکتہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

پہلی اور دوسری دونوں آیتوں میں خدا تعالیٰ نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرض کا ذکر کیا ہے ۔ لیکن پہلی آیت میں بظاہر الفاظ تمام امت کے لئے نہیں ، بلکہ امت میں سے ایک جماعت خاص کے لئے اس کا فرض ہونا معلوم ہوتا ہے ۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۔

تم میں سے ایک جماعت ہونی چاہیئے جو خیر کی طرف بلائے اور نیکی کا حکم دے ۔

لیکن دوسری آیت میں کسی ایک جماعت کی تخصیص نہیں ہے ۔ تمام امت کا امتیاز ہی اسی فرض کو قرار دیا ہے ۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۔ الخ

تم سب میں بہتر امت ہو ، اس لئے کہ نیکی کا حکم دیتے ہو ۔ الخ

دونوں آیتیں ایک ہی سورت اور ایک ہی رکوع میں ہیں ۔ پھر دونوں میں اختلاف کیوں ہے ؟ پہلی میں یہ فرض محدود و مخصوص اور دوسری میں عام ہے ۔

عام خیال یہ ہے کہ پہلی آیت میں خدا تعالیٰ نے جن فرائض کا ذکر کیا ہے ، ان میں سے ہر فرض اپنی تکمیل کے لئے علم کا محتاج ہے ۔ دعوت الی الخیر کے لئے ضرور ہے کہ اعمال خیر کا علم ہو ، امر بالمعروف کیونکر انجام پا سکے گا جبکہ وہ کام معلوم نہ ہوں گے جن پر معروف کا اطلاق ہو سکتا ہے ؟ نہی عن المنکر تو اور زیادہ علم و فضل اور درس و تدریس کا محتاج ہے ، کیونکہ منکرات میں تمام محرمات و مکروہات فقہیہ داخل ہیں اور جب تک ان کا علم نہ ہو کیونکر ان سے روکا جا سکتا ہے ؟

اس تفسیر کی بنا پر فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ اس آیت (ولتکن منکم) میں (من) تبعیض کے لئے آیا ہے ، اس سے صرف ایک گروہ محدود (علماء) مراد ہے اور یہ تینوں باتیں صرف انہی کے فرائض میں داخل ہیں ۔

علما نے اس فرض عام کو اپنے لئے مخصوص کر لیا

لیکن درحقیقت یہ خیال علما اور اعتقاد ایک ایسی خطرناک غلطی تھی جس کو نہیں سمجھتا کہ کن لفظوں سے تعبیر کروں؟ اس تیرہ سو برس میں اسلام کو ان تمام غلط فہمیوں سے سابقہ پڑا جو اس سے پہلے امم سابقہ کو پیش آ چکی ہیں، لیکن کسی سخت سے سخت تحریف نے بھی مسلمانوں کو ایسا لا علاج نقصان نہیں پہنچایا جیسا اس غلطی سے پہنچا اور پہنچ رہا ہے۔ اسلام کی وہ دعوت الٰہی جو ایک عالمگیر اصلاح اور دین الملی جامعہ کے قیام کے لئے آئی تھی، اسی غلط فہمی سے زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔

آتے

خلافت و نیابت الٰہی کا وہ شرف، جو مسلمانوں کو عطا کیا گیا تھا اور جس کی وجہ سے بحیثیت ملی وہ تمام عالم میں خدا کا مقدس دستِ عمل تھے، بدبختانہ اسی غلط فہمی سے خاک میں ملا۔ رؤسائے روحانی اور پیشوایانِ مذہب نے جو شر کا سارا اختیارات اپنے لئے مخصوص کر لئے تھے، اور جن کی غلامی سے دنیا کو نجات دلانا اس دینِ الٰہی کا اصل مشن تھا غلامی کی بیڑیاں پھر اسی غلط فہمی کی لعنت سے مسلمانوں کے پاؤں میں پڑیں اور ایسی پڑیں کہ اب تک نہ نکل سکیں۔ چالیس کروڑ فرزندانِ الٰہی، جن کو اپنے اعمالِ حسنہ سے دنیا میں خدا کی تقدیس کا تختِ جلال بننا تھا، آج اپنی بداعمالیوں سے تمام قومی جرائم اور ملی معاصی میں گرفتار ہیں، اور قہرِ الٰہی کو مدتوں سے دعوت دے رہے ہیں۔ یہ وہی معاصی ہیں جن کی پاداش میں اقوامِ گذشتہ سے خدا نے اپنا رشتہ توڑا تھا، جن کی وجہ سے داؤدؑ کے بنائے ہوئے ہیکل سے روٹھ کر رحمتِ الٰہی نے اسماعیل کی چنی ہوئی دیواروں کو اپنا گھر بنایا تھا، اور پھر جن کی وجہ سے بنی اسرائیل کو اپنی نیابت سے معزول کر کے مسلمانوں کو اس پر سرفراز کیا تھا۔

ولقد اهلكنا القرون من قبلكم لما ظلموا وجاءتهم رسلهم بالبينات وما كانوا ليؤمنوا كذٰلك نجزي القوم المجرمين۔ ثم جعلناكم خلائف في الارض من بعدهم لننظر كيف تعملون

اور تم سے پہلے کتنی قومیں گذر چکی ہیں کہ جب انھوں نے ظلم و معاصی پر کمر باندھی تو ہم نے انھیں ہلاک کر دیا۔ ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے مگر انھیں ایمان

نصیب نہیں ہوا، مجرموں کو ہم ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔ پھر ان کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے تم کو دنیا کی بادشاہت دے کر ان کا جانشین بنایا تاکہ دیکھیں کہ کیسے عمل کرتے ہو۔ مگر یہ بدبختی بھی صرف اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔

لیکن یہ سب کچھ کیونکر ہوا؟ اس طرح کہ اعتقاد ہی سے عمل وجود پذیر ہوتا ہے، اس غلط فہمی کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ (امر بالمعروف) جو در اصل ہر فرد اسلامی کا فرض تھا، اور صحابہ کرام کی زندگی اس کی عملی شہادت ہمارے سامنے ہے۔ وہ روز بروز ایک محدود دائرے میں سمٹتا گیا، اور سمٹتے سمٹتے ایک غیر محدود [illegible] کر رہ گیا، اب اس کے وجود میں بھی شک ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب کے انحطاط و ہلاکت کی ایک بڑی علت رو سائے مذہبی کا معبودانہ اقتدار ہے۔ اسلام نے اس زہر کا تریاق یہ اصل اصول تجویز کیا تھا کہ امر بالمعروف کی خدمت کو اس طرح عام، اور ہر فرد ملت پر پھیلا دیا جائے، کہ پھر کسی مخصوص گروہ کو اس ذریعہ سے اقتدار حاصل کرنے کا موقعہ نہ ملے۔ اور یہودیوں کے برہمنوں اور عیسائیوں کے رومن کیتھولک پادریوں کی طرح، مذہبی دعوت و اصلاح کو کوئی جماعت اپنی اقلیم حکمرانی نہ بنائے کہ فعل ما یشاء و یحکم ما یرید۔ لیکن اب صدیوں سے دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان جن بیڑیوں کو کاٹنے آئے تھے ان سے خود ان کے پاؤں بوجھل ہو رہے ہیں۔ اس فرض الٰہی کو (علماء) نے اپنا موروثی حق بنا لیا ہے جس میں اور کسی فرد کو دخل دینے کی اجازت نہیں۔ شیطان (اپنی قدیمی عادت کی طرح) جب ضرورت دیکھتا ہے ان کو اپنے عمال (اولیاء) کے لئے آلہ کار بنا لیتا ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی جگہ (امر بالمنکر و نہی عن المعروف) کے فرائض ان کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں۔ باقی تمام قوم اپنے اس فرض کی طرف سے غافل و بے خبر ہے اور جہل مذہبی کے سبب سے [illegible] کے اس غصب حقوق عامہ پر قانع ہو گئی ہے۔ خدا کی حکومت کوئی بھی اپنے دل میں محسوس نہیں کرتا، نیکیوں کی طرف سے سب کی آنکھیں بند ہیں، اور برائیوں پر سے ہر شخص اس طرح گذر جاتا ہے گویا اس کو کان سننے کے لئے اور آنکھیں دیکھنے کے لئے ملی ہی نہیں۔

فانها لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور (الحج ۲۲ : ۴۶)

دونوں آیتوں کا منشا ایک ہے

حقیقت یہ ہے کہ دونوں آیتوں میں کوئی اختلاف نہیں، دونوں کا منشاء ایک ہے اور دونوں اس فرض کو بغیر کسی تخصیص و تحدید کے ہر قائل کلمۂ توحید کا فرض قرار دیتی ہیں، البتہ پہلی آیت میں (ولتکن منکم) کا لفظ اشتباہ پیدا کرتا ہے کہ (منکم) بیان تبعیض کے لئے ہے یعنی تم میں سے بعض لوگوں کی ایک جماعت اس فرض کو اپنے ذمے لے، لیکن چونکہ آگے چل کر دوسری آیت نے اس فرض میں تمام امت کو شامل کر دیا ہے اس لئے یہاں (منکم) کو تبعیض کے لئے قرار دینا ہی غلط ہے، بلکہ وہ یقیناً توضیح و تبیین کے لئے آیا ہے جیسا ہر زبان کے محاورے میں عموماً بولا کرتے ہیں۔ مثلاً عربی میں کہیں گے۔ للامیر من غلمانہ عسکر۔ وبفلان من اولادہ جند۔ یعنی امیر کے لڑکوں سے فوج کے سپاہی ہیں اور فلاں شخص کی اولاد سے لشکر مرتب ہو رہا ہے، تو اس سے امیر کے تمام لڑکے مراد ہوں گے نہ کہ بعض۔ خود قرآن میں ایک موقعہ پر فرمایا ہے کہ فاجتنبوا الرجس من الاوثان۔ (۳۱/۲۲) مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بتوں کے علاوہ اور کسی شے کی ناپاکی سے پرہیز نہ کیا جائے۔ غرضکہ یہاں (من) افادہ معنی تبیین کرتا ہے نہ کہ تبعیض (امام رازیؒ) نے دوسرے قول کو بیان کرتے ہوئے اس پر کافی بحث کی ہے۔ فمن شاء التفصیل فلیرجع الیہ (جلد ۲۔ ۲۲۸)

لیکن اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے ہم قرآنِ مجید کی ایک اور آیت اس مضمون کے متعلق پیش کرتے ہیں، اگر (امام رازی) نے اس آیت کو بھی پیش نظر رکھا ہوتا تو ان کو متعدد آراء و توجیہات کے لاحاصل نقل کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ سورہ (حج) کے پانچویں رکوع میں خداتعالیٰ نے کافروں کے اُن مظالم کی طرف اشارہ کیا ہے، جن سے آغاز اسلام کے مسلمانوں کو سامنا ہوا تھا پھر دفاع و حفظ نفس کے لئے قتال کی اجازت دی ہے۔ اور اس کے بعد کہا ہے۔

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلٰوۃ واٰتوا الزکٰوۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر، وﷲ عاقبۃ الامور۔ (۴۱/۲۲)

اگر ہم ان (مظلوم مسلمانوں) کو (حکومت اور خلافت) دے کر زمین میں قائم کر دیں تو وہ

نہایت اچھے کام انجام دیں گے یعنی نماز پڑھیں گے، زکوٰۃ دیں گے، لوگوں کو اچھے کاموں کو حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے اور سب کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

یہ آیت اس بارے میں بالکل صاف اور فیصلہ کن ہے۔ خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیاب کرنے کی علت یہ بیان کی ہے کہ وہ زمین پر حکمران ہونے کے بعد اچھے اور نیک کاموں کو انجام دیں گے۔ پھر ان کاموں کی بالترتیب تشریح کی ہے اور سب کو مسلسل عطف کے ساتھ بیان کیا ہے، جو معطوف و معطوف علیہ میں تسویہ ثابت کرتا ہے۔ پہلے نماز کا ذکر کیا، پھر زکوٰۃ کا۔ اور یہ دونوں عمل ہر جگہ قرآن میں ایک ساتھ بیان کئے گئے ہیں اس کے بعد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نام آیا ہے اور اسی سلسلۂ اعمال میں، جس میں نماز اور زکوٰۃ بلحاظ وجوب و فرض بیان کئے جاتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ

(۱) مسلمانوں کو خدا نے جو نصرت و فتح اور دنیا میں کامیابی عطا فرمائی اس کی علت یہ تھی کہ وہ اعمال حسنہ انجام دیں۔

(۲) وہ اعمال حسنہ (علی الخصوص) قیام نماز، ادائے زکوٰۃ، اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہیں۔

(۳) نماز اور زکوٰۃ ہر مسلمان پر فرض ہے پس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ہر مسلمان کے فرائض میں داخل ہے۔　　(الہلال - ۱۸ اگست ۱۹۱۲ء - صفحہ ۳)

علاوہ بریں آیت (ولتکن منکم امۃ ......) کے آخر میں ہے۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ "اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔ اگر "امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کو ایک الگ گروہ کے ساتھ مختص کر دیا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن کریم کی رو سے یہ خاص گروہ ہی فلاح پائے گا۔ باقی امت نہیں۔ یہ بدیہی طور پر غلط ہے۔ قرآن کریم نے فلاح و سعادت کی راہ کو تمام مومنین کے لئے کھلا رکھا ہے، نہ کہ ان میں سے کسی خاص جماعت کے لئے۔ اس میں اگر "فلاح" کا ذکر کسی خاص صفت کے سلسلہ میں آیا ہے، تو وہ صفت بھی تمام مومنین کا خاصہ بتائی گئی ہے۔ فلاح و سعادت کو ایک خاص گروہ کے اندر محدود کر دینے کا تصور تو اسلامی تعلیم کو جڑ اور بنیاد سے اکھیڑ دیتا ہے۔ اس سے بھی واضح ہے کہ آیت (ولتکن منکم امۃ ......) سے مراد تمام جماعت مومنین ہے۔ اس میں کا کوئی الگ گروہ نہیں۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے "امور مذہبی اور تبلیغ اسلام" کے لئے ایک الگ مخصوص گروہ کا تصور اس وقت

پیدا ہوا جب سیاست کو دین سے الگ کر لیا گیا یعنی جب مملکت سیکولر (SECULAR) ہو گئی (اس حقیقت کو نظر انداز نہ کیجئے کہ محض شریعت کے مطابق تعزیرات سے کوئی مملکت اسلامی نہیں ہو جاتی وہ اسلامی اس وقت ہوتی ہے جب اس کا تمام کاروبار قرآنی احکام و اصول کے مطابق سرانجام پائے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ سیکولر رہتی ہے)۔ ہر سیکولر اسٹیٹ میں امور مذہبی کے لئے الگ شعبہ (ECCLESTASTICAL DEPARTMENT) ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت میں پوری کی پوری مملکت "امور مذہبی" کے لئے وقف ہوتی ہے یعنی مملکت کا تمام کاروبار، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پاتا ہے۔ اس لئے وہ دینی ہو جاتا ہے جب تک کسی مملکت میں "امور مذہبی" کے لئے ایک الگ گروہ مخصوص رہے گا وہ مملکت سیکولر رہے گی۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے۔

(۱) امر بالمعروف و نہی عن المنکر پوری کی پوری امت کا فریضہ ہے۔ امت میں کسی الگ گروہ کا نہیں۔

(۲) امت اس فریضہ کو اپنی حکومت کے ذریعہ سرانجام دیتی ہے۔ ان کی یہ حکومت اس انداز کی ہوتی ہے جس میں ہر فرد امت، بالواسطہ یا بلاواسطہ شریک ہوتا ہے اور اس کا سارا کاروبار قرآنی حدود کے اندر سرانجام پاتا ہے۔

بقیہ "لمعات"

صفحہ ۱۶ کے بعد دیکھئے

ان تدابیر سے پاکستان کی آئیڈیالوجی پر (جو درحقیقت اسلامی اصولوں ہی کا دوسرا نام ہے) یقین پیدا ہوگا اور جوں جوں یہ یقین محکم ہوتا جائے گا، پاکستان مستحکم ہوتا جائے گا۔ اگر یہ یقین محکم نہ ہوا، تو پاکستان کبھی مستحکم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ ــــ

آدم ہمہ سر واز بے یقینی۔

حقائق و عبر

وحدتِ امت

اپریل ۱۹۶۲ء کے ماہنامہ ثقافت (لاہور) میں سید محمد جعفر شاہ صاحب پھلواری (ندوی) کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "کلمۂ سواء"۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ اسلام کا منتہیٰ تمام انسانوں کی ایک عالمگیر برادری تشکیل کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ خود امتِ مسلمہ میں وحدت ہو۔ یہ وحدت صرف اسی صورت سے حاصل ہو سکتی اور قائم رہ سکتی ہے کہ قرآن کریم کو اس کی بنیاد تسلیم کر لیا جائے۔ مگر ایسا نہ کیا جائے تو امت میں فرقہ بندی موجود رہے گی جو قرآن کی رو سے شرک ہے، اور توحید کی نقیض۔ اس مقالہ کے جستہ جستہ حصے ملاحظہ فرمائیے۔

> خوب غور کیجئے تو اختلافِ امت کا اصل سبب یہی نظر آئے گا کہ ہم میں سے ہر فرقے نے اپنا اپنا جداگانہ پیشوا و امام بنا رکھا ہے۔ صرف امام و پیشوا بنا لینے میں تو چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن ہوا یہ کہ ہر شے کو اسی امام و پیشوا کی نسبت سے دیکھا جانے لگا یعنی ہر چیز کو پرکھنے کی آخری کسوٹی واحد معیار اور تنہا سند یہی امام بن گیا۔ گویا وہ جس بات کو صحیح کہہ دے وہ صحیح اور جسے وہ غلط بتائے وہ غلط۔ مثلاً فرض کیجئے ایک امام کہتا ہے کہ دفعتہً تین طلاقیں مغلظہ ہوتی ہیں اور دوسرا کہتا ہے کہ رجعی ہوتی ہیں تو دونوں کے پیرو اپنے اپنے موقف پر قائم رہیں گے اور کوئی بھی اپنا تقلیدی مسلک نہ چھوڑے گا جسے اس نے آخری سند تسلیم کیا ہے وہ اس سے ہٹنے پر آمادہ نہیں۔ لہٰذا اتحاد کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

وحدت انسانی سے پہلے وحدتِ امت ضروری ہے۔ خاتم النبیینؐ کے پیغامِ وحدتِ انسانی کے بعد قدرتاً دو گروہ ہوجاتے ہیں۔ ایک وہ جو اس تصور کے پیغام کو مانے اور دوسرا وہ جو اس سے انکار کرے۔ اسی حقیقت کو قرآنی اصطلاح میں اسلام اور کفر کہتے ہیں۔ دوسری طرف امت ہی کے اندر ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے نزدیک وحدت امت باقی رہے یا ختم ہوجائے اور اصل دین باقی رہے یا نہ رہے مگر ان کا اپنا فرقہ اور اس کے محدود تصورات ضرور باقی رہیں، یہی وہ جذبہ ہے جسے قرآن نے شرک بتایا ہے۔

سوچئے کہ نسل کو اسلام نے قومیت کی بنیاد کیوں نہیں بنایا؟ یہ کیوں ہوا کہ حقیقی عم رسولؐ (ابولہب) کو کافر اور جہنم کا ایندھن بتایا گیا اور بلالؓ حبشی، صہیبؓ رومی اور عبداللہؓ بن سلام کو آغوشِ فردوس میں جگہ دی گئی؟ اگر نسل کو بنیاد قومیت قرار دیا جاتا تو اس نسل کے سوا باقی تمام نسلوں کے لئے دروازہ بند ہوجاتا اور وحدتِ انسانی کے لئے کوئی جگہ ہی نہ رہتی۔ اسی طرح رنگ، ادیان، پیشے اور وطن کو بھی سمجھ لیجئے۔ ان میں سے کوئی شے بھی ایسی نہیں جو وحدتِ انسانی تو کجا وحدتِ امت کا بھی مقصد پورا کر سکے۔ بالکل یہی شکل فرقہ بندیوں کی بھی ہے کوئی ایک فرقہ بھی ایسا نہیں جو وحدتِ امت کے مقصد کو پورا کر سکے۔

مجھے یہاں یہ بات نہیں بھولتی جو قائداعظم نے کئی بار کہی تھی۔ ان سے جب بھی کسی نے دریافت کیا کہ پاکستان کا دستور کیا ہوگا تو انھوں نے ایک ہی جواب دیا کہ قرآن ــــــ وہ اللہ کا بندہ کبھی اس سے پیچھے اترا ہی نہیں اس کا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیئے کہ انھیں دوسرے علوم اسلامی سے انکار تھا۔ فہم قرآن کے لئے احادیث و روایات، فقہی مکاتب فکر، تاریخ، لغت، صرف، نحو، معانی، بیان وغیرہ سب ہی ضروری ہیں لیکن ساری دنیا کے مسلمانوں کے لئے نقطۂ اتحاد، مرکزِ دعوت اور کلمۂ سواء" صرف قرآن ہی ہو سکتا ہے۔ دیگر تمام علوم بھی (حسب مراتب) اسلامی ہی علوم میں داخل ہیں اور سب ہی فہم قرآن میں مددگار ہیں لیکن جس طرح رنگ، زبان، نسل، وطن، پیشے کے اختلافات کے باوجود کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" وحدتِ انسانی کی بنیاد ہے اسی طرح روایات، تاریخ، فقہ وغیرہ کے اختلافات کے باوجود وحدت امت کی اساس صرف قرآن

ہے اس سے جس قدر پیچھے اترتے جائیں گے۔ اسی قدر تفریق امت میں اضافہ ہوتا جائیگا۔
اس لئے اگر ہم وحدتِ امت چاہتے ہوں تو کسی دوسری چیز سے اتنا نہیں چمٹنا چاہیئے جو قرآنی وابستگی پر حاوی و مسلط ہو جائے۔

آپ نے غور فرمایا کہ محترم پھلواروی صاحب کے نزدیک وحدتِ امت، صحیح اسلام کے لئے کس قدر لازینفک ہے۔ لیکن ثقافت کے اسی پرچہ میں، محترم رئیس احمد جعفری صاحب کے قلم سے "تاثرات" وافتتاحیہ شائع ہوئے ہیں۔ وہ اس میں لکھتے ہیں:۔

چند روز ہوئے "طلوعِ اسلام" کا ایک پرچہ نظر سے گذرا۔ اس میں پرویز صاحب نے اپنے دینی افکار و خیالات کے بارے میں بیان صفائی دیتے ہوئے بعض ایسی باتیں ارشاد فرمائی ہیں، جو غور و فکر کی مستحق ہیں۔

پرویز صاحب کو موجودہ اسلامی فرقوں کے وجود پر اعتراض ہے۔ ان کا خیال ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد گرامی میں نہ کوئی سنی تھا، نہ شیعہ، نہ حنفی، نہ مالکی، نہ شافعی، نہ حنبلی۔ سب مسلمان تھے، بعد میں یہ فرقے پیدا ہوئے۔ ان فرقوں نے شرع و آئین کی نئی تعبیریں کیں اور انھیں جزو مذہب بنالیا۔ لوگ اسلامی حکومت، اسلامی نظام، اسلامی دستور کا نام لیتے ہیں، مگر یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ اتنے فرقوں کی موجودگی میں اسلامی حکومت کس طرح قائم ہو سکتی ہے؟ اسلامی نظام کیونکر استوار ہو سکتا ہے؟ اسلامی دستور کی تدوین کس طرح ممکن ہے؟ لہٰذا اگر اسلامی دستور بنانا اور اسلامی حکومت قائم کرنا ہے تو ان فرقوں کو ختم کرنا پڑے گا۔ اور یہ "مرکزِ ملت" کا کام ہوگا کہ وہ انھیں ختم کر کے اسی حالت پر لے آئے جو عہدِ رسالت مآب میں تھی، یعنی صرف مسلمان!

پرویز صاحب کا یہ خیال بڑا دلفریب معلوم ہوتا ہے اور بظاہر اس کی اصابت شک و شبہ سے بالاتر نظر آتی ہے لیکن اگر علمی سطح پر اس کا جائزہ لیا جائے اور تاریخ کی روشنی میں اس کے مضمرات پر غور کیا جائے اور عمل و تاثر کے پیمانے سے اسے ناپا جائے، تو اس کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ

تکلف برطرف ہے ایک اندازِ جنوں یہ بھی

یعنی وہی وحدتِ امت' جو ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے ایک رکن (پھلواروی صاحب) کی تحقیق کی رو سے مقصد توحید اور اصل دین ہے' اسی ادارہ کے دوسرے رکن (جعفری صاحب) کے نزدیک "نفاذِ جنون" ہے ——— اور طرفہ تماشا یہ کہ ان دونوں حضرات کے اسمائے گرامی' ادارہ تحریر کے ارکین" کی فہرست میں درج ہیں۔

اللہ رحم کرے' اس اسلام پر جس کی ریسرچ کرنے والے ادارہ کی کیفیت یہ ہو کہ ان کے ایک رکن کے نزدیک وحدتِ امت کا تصور اصل دین ہو' اور دوسرے رکن کے نزدیک پاگل پن!

خریدارانِ طلوعِ اسلام کی اطلاع کیلئے

اس سے پہلے بھی یہ اعلان شائع کیا جا چکا ہے کہ

ہر خریدار کی اطلاع کے لئے جس کا سالانہ چندہ ختم ہو رہا ہو' سابقہ خریداری کے آخری پرچہ میں ایک مطبوعہ کارڈ (BUSINESS REPLY CARD) منسلک کیا جاتا ہے۔ یہ کارڈ پہلا ورق اُلٹتے ہی متعلقہ خریدار کے سامنے آئیگا اور چندہ ختم ہونے کی باضابطہ اطلاع شمار ہوگا۔ ایسے خریداروں کو چاہیئے کہ آئندہ خریداری کے سلسلے میں اس کارڈ میں حسب ضرورت خانہ پُری کر کے' جلد از جلد اسے ادارہ کو واپس ارسال کر دیں۔ اس کارڈ پر ٹکٹ لگانے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ خرچ ادارہ کے ذمے ہوگا۔ ہمیں افسوس ہے کہ اس سلسلے میں' سابقہ دو اشاعتوں میں جو کارڈ منسلک کر کے بھیجے گئے' بہت سے خریداروں نے ان کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اور کارڈ واپس ارسال کرنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی۔ برائے نوازش آئندہ کے لئے اس کا پورا خیال رکھئے اور پہلا ورق اُلٹتے ہی اگر ایسا کارڈ سامنے آئے تو جس قدر جلد ممکن ہو مناسب خانہ پری کے ساتھ ادارہ کو واپس ارسال کر دیجئے۔ اس طرح آپ ادارہ کو بہت سی پریشانیوں سے بچا سکیں گے۔

(ادارہ طلوعِ اسلام)

(۱) طلوعِ اسلام کنونشن میں
خواتین کی تقاریر کا بقایا حصہ

گھروں کا چین۔ گھروں کی سلامتی

(محترمہ بیگم سکندرہ ریاض)

معزز بہنوں و بھائیو! السلام علیکم

اپنے قابلِ احترام بھائی شمعِ قرآنی کے پروانے جناب پرویز صاحب اور اپنی عزیز و محترم سالارِ قافلہ حمیدہ جہاں خواجہ کے فرمان کی تعمیل میں آپ کے سامنے حاضر ہوں۔ ورنہ میرا اصول تو یہی رہا ہے کہ سنو زیادہ بولو کم۔ جو لطف سننے میں آتا ہے وہ بولنے میں کہاں! کالج اور یونیورسٹی کی سند یافتہ بہنیں و بیٹیاں تو بولنے میں ماہر ہوتی ہیں اور انھیں ہونا بھی چاہیئے ماحول کے اثرات اپنے نقوش ثبت ہی کرتے ہیں لیکن میں تو صرف ایک عام گھریلو عورت ہوں ظاہر ہے کہ میری پروازِ خیال بھی اپنے ہی عام گھریلو مسائل تک ہے اور انھیں کے متعلق کچھ کہہ سکتی ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ میری ابتدائی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی جو قرآن کے نور سے منور تھا۔ جہاں بچے کو پہلا لفظ اللہ کہنا سکھایا جاتا تھا اور جہاں ہر وقت ہر کام میں ہر بات میں انشاءاللہ، بسم اللہ، ماشاءاللہ، سبحان اللہ، الحمدللہ کی آوازیں آتی تھیں اور معصوم ذہن غیر شعوری طور پر اس طرف منتقل ہو جاتے تھے کہ یہ اللہ کون ہے؟ کیا ہے؟ کہاں ہے؟ جس کا نام جس کا ذکر ہر زبان پر ہر بات میں آتا ہے۔

بات دوسری طرف چلی جائے گی اس لئے اس تمہید کو مختصر کرتی ہوں۔ ہمارا یہ سالانہ اجتماع ایک دوسرے سے ملاقات اور افہام و تفہیم کا بہترین ذریعہ ہے۔ کچھ اپنی کہی، کچھ دوسروں سے سنی۔ آپ بیتی بھی، جگ بیتی بھی خوشیوں کے نغمے بھی اور دکھ کے آنسو بھی۔ زندگی میں سب کچھ ہے۔ اور یہ قرآن ہی کا اعجاز ہے۔ اپنوں کی تو بات ہی کیا غیروں کو بھی اپنا بنا دیتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو نہ جاننے کے باوجود بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا دکھ سکھ ایک ہے ہمارا

مقصد ہماری منزل ایک ہے۔ ہمارے ذوق و شوقِ قرآنی نے ہی ہمیں اس جگہ جمع کیا ہے۔

ہماری زندگی پر ہمارے اپنے خیالات و نظریات کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں ہم اس کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے صدیوں کے جمود نے ہماری قوتِ فکر و عمل کو کھو دیا ہے (Too much rest is rust) بہت زیادہ آرام زنگ لگا دیتا ہے یعنی اگر ہم اپنی ذہنی قوتوں اور صلاحیتوں سے کام لینا چھوڑ دیتے ہیں تو کچھ عرصے بعد ہماری قوتِ غور و فکر اس قابل ہی نہیں رہتی کہ ہم اپنی عقل و فہم کو بروئے کار لاسکیں۔ اپنے لئے مقصد و منزل کا تعین کرسکیں۔ نیک و بد میں حدِ امتیاز قائم کرسکیں بس روایات وہ بھی سنی سنائی، تحقیق شدہ نہیں، کا سہارا لئے مقصد و منزل سے بے خبر ایک دوسرے کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔ یہی کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے۔ ہم سے مراد آپ سب بھی ہیں ان سعید ہستیوں کو چھوڑ کر جو اللہ تبارک و تعالیٰ اور اس کی کائنات میں غور و فکر ہر دم کرتے رہتے ہیں اور جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ

الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ
وَالْأَرْضِ ج رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا ج فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

اس وقت میری مراد خصوصیت سے اپنے طبقے سے ہے۔ میری بہنیں اور بیٹیاں مجھے معاف کریں۔ ممکن ہے کہ انہیں میری صاف گوئی بری لگے۔ لیکن مرض کی تشخیص کے بغیر علاج ممکن نہیں ہے۔ صحت حاصل کرنے کے لئے کڑوی دوا پینی ہی پڑتی ہے۔ زخم کے لئے نشتر کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

انسانی زندگی میں گھر کی اہمیت کیا ہے؟ یہ محتاجِ بیان نہیں۔ ہر جاندار کو گھر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک جگہ جہاں وہ تمام دن کی محنت و مشقت کے بعد آرام و سکون حاصل کرسکے۔ اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے۔ غریب کو اپنی جھونپڑی میں جو آرام ملتا ہے وہ اس کو راجہ کے محل سے زیادہ ہے۔ گھر کے معنی ہی وہ مقام ہے جہاں گھر والے کو ہر طرح کی سہولت بے فکری و سکون و اطمینان حاصل ہوسکے۔ سکون وہ شے ہے یا وہ جذبہ ہے جس کی تلاش میں انسان ہمیشہ سرگرداں نظر آتا ہے اور اگر اس کو اپنے گھر میں سکون نہ میسر آسکے تو پھر وہ گھر سے باہر اس کی تلاش کرتا ہے اور بعض اوقات شدید مشکلات میں بھی گرفتار ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے گھروں میں امن و سکون قائم رکھنا کس کی ذمہ داری ہے؟ اور کس طرح اس ذمہ داری کو پورا کیا جاسکتا ہے؟ اس جہانِ رنگ و بو میں مرد و عورت دونوں کو شریکِ کار بنایا گیا ہے اور خالقِ کائنات نے جو دونوں کا رب ہے ان کے لئے میدانِ عمل بھی تجویز کر دیا۔ فضیلت پیدائش و جنس کے اعتبار سے نہیں بلکہ مدارج کا تعین اعمال سے مقرر فرما دیا۔ دونوں کے دائرہ عمل جدا ہیں لیکن اس طرح ہر ایک دوسرے کے تعاون و ہمدردی ایثار و خدمت کا ضرورت مند ہے۔ اور آپس کی ہم آہنگی و تفہیم کے بغیر امن و سلامتی کی خواہش کبھی

پوری نہیں ہو سکتی ہے۔

تقسیم کار کی رو سے (کسی فائق فضیلت کی بنا پر نہیں) گھروں میں امن و سلامتی قائم رکھنا اور آئندہ اور موجودہ دونوں نسلوں کی پرورش و تربیت کی اہم ذمہ داری نہیں سونپی گئی ہے۔ ہمارا اس سے انکار کرنا ہمیں کبھی کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔ اپنی ذمہ داریوں کو قرآن کی روشنی میں سمجھنے کی اشد ضرورت ہے اور پھر پورے سکون یقین محکم کے ساتھ عمل پیہم کی۔

گھر میں سکون و امن کے لئے لازم ہے کہ اس کے رہنے والوں میں ہم آہنگی ہو۔ نظریات میں بنیادی اختلافات نہ ہوں اور اسی لئے اللہ تعالے نے جہاں مرد و عورت کی دائمی رفاقت نکاح کا ذکر کیا ہے وہاں فرمایا ہے کہ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ ۚ وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ ——— یعنی کہ اگر میاں بیوی جن سے گھر کے امن و سکون کی ابتدا ہوتی ہے مختلف نظریات کے حامل ہوں تو وہ گھر کبھی جنت کا نمونہ نہیں بن سکتا۔ ایسے شخصوں کا اجتماع جہنم کی زندگی پیدا کرے گا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کا قانون ہماری ہی حفاظت و فلاح کے لئے ہمیں اس سے روکتا ہے۔ یہ تنگ نظری نہیں ہے۔

آپس میں افہام و تفہیم کا جذبہ اور محبت و خلوص کے ساتھ ایک دوسرے کے جذبات کا احترام و احساس بھی لازمی ہے۔ ایثار و خدمت ایک مومن کی زندگی کا شعار ہیں۔ يُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹) فرمایا کہ وہ دوسروں کو اپنے پر ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خود تنگی میں گذارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ اور یہ بھی کہ جب دوسروں کے فائدے کا کام کرتے ہیں تو ان سے کہہ دیتے ہیں کہ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا (۷۶/۹) ہم تم سے اس کا نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔

آپ سوچئے کہ جس گھر میں یہ فضا ہوگی ایثار و خدمت کا یہ جذبہ ہوگا اس کا ہر مکین کیوں نہ خوش و خرم رہے گا اور یہ بھی یقین کیجئے کہ جو بچے امن و سکون صلح و آشتی کی قرآنی فضا میں پل کر جوان ہوں گے وہ بھی انہی خوبیوں کے حامل ہوں گے اور اپنے اپنے وقت پر جب وہ نئے گھر بسائیں گے تو معاشرہ میں رحمت و برکت بن کر قوم و ملک سب کے لئے سکون و شادمانی کا باعث بنیں گے۔ یہ بھی قانون قدرت ہے کہ ہر بچہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور اس کی آئندہ زندگی کا بیشتر دارو مدار اس کی ابتدائی تربیت پر منحصر ہوتا ہے۔ برعکس اس کے جہاں آپس میں اختلافات ہوں اور نہ جذبہ ایثار و خدمت ہو نہ احترام جذبات ہو۔ ہر وقت بحث مباحثے طعن و تشنیع۔ تندخوئی و سخت کلامی کے مظاہرے ہوں وہاں کی پوری فضا مسموم ہو جاتی ہے اور بچے جو طبعاً نازک جذبات رکھتے ہیں وہ گھبرا جاتے ہیں۔ ان کے معصوم دل کملا جاتے۔ نہ دل میں وہ امنگ رہتی ہے نہ ترقی و کامیابی کی خواہش اور ان کی پوری زندگی ماں باپ کی نادانی سے ان کے لئے ایک

بارِ گراں بن جاتی ہے۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ امن و سکون کی تلاش میں وہ بھٹک جاتے ہیں۔ بدمزاج، خودغرض اور کاہل بن جاتے ہیں اور معاشرہ کے لئے مسائل کو پیچیدہ تر بنا دیتے ہیں۔

سوچئے کہ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اپنے بچوں کی خاطر، اپنی قوم کی ترقی و وقار کی خاطر کیا یہ ہمارا فرض نہیں کہ ہم اپنے گھروں کو جنت کا نمونہ بنائیں۔ جہاں ہر ایک کو مساوی حقوق حاصل ہوں محبت و خلوص کی فضا میں ہر ایک کے مسائل کا جائزہ لیا جائے۔ آپس کے اختلافات خوش اسلوبی سے طے کئے جائیں۔ ہر فرد دوسرے کے لئے ایثار و خدمت کا پیکر ہو۔ ہر ایک کی ضروریات پوری ہوتی رہیں نہ طعن ہو نہ تشنیع۔ ہر ایک کو اس کے مقام پر رکھا جائے تو کبھی گھروں میں جھگڑے نہیں ہوتے۔ ہر رشتہ اپنی اہمیت رکھتا ہے۔ اپنے حقوق رکھتا ہے اور یہ ہمارا ہی فرض ہے کہ ہر ایک کا حسبِ رشتہ خیال اور لحاظ رکھیں اپنے بچوں کو بھی قولاً و عملاً یہی تعلیم دیں کہ ہر ایک کا حق اپنی اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور ان حقوق کی ادائیگی میں ہی امن و سکون کا راز ہے۔

یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارا معاشرہ بالکل بگڑ چکا ہے۔ گھروں میں معدودے چند کے علاوہ سکون کا فقدان ہے۔ والدین اولاد سے اور اولاد والدین سے نالاں ہیں۔ اپنی اپنی نفسی نفسی اپنا اپنا راگ لیکن کوئی بات بھی ناممکن نہیں صرف ایک بار ہمت کی اور قوتِ عمل کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہمارا ایمان صرف لفظی نہیں علی وجہ البصیرت ہے تو پھر ہمیں اس کے ثبوت کے لئے اپنے کردار کا جائزہ لینا چاہیئے اور خلوصِ قلب سے اصلاحِ احوال کی کوشش کرنا چاہیئے۔

گذشتہ سال ہماری ایک بہن نے عورت کے مقام پر قرآنی دلائل کی روشنی میں بہت کچھ ہماری رہنمائی کی اور ساتھ ہی ہماری دو بیٹیوں نے عورت کی مظلومی کی داستان بڑے ہی موثر پیرایہ میں بیان کی۔ میں نہ کسی کی ہمنوائی کرنا چاہتی ہوں نہ تردید۔ بحث سے بھی مسائل الجھ جاتے ہیں۔ جیسا کہ شروع میں عرض کیا ہمدردی و خلوص کے ساتھ افہام و تفہیم ہمیشہ فائدے مند ہوتے ہیں۔

جب سے ہوش سنبھالا یہی داستانِ ظلم و ستم سنتے آئے اور پڑھتے آئے لیکن میری ہمنوا خفا نہ ہو جائے۔ ممکن ہے میری نگاہ کی غلطی اور عقل کی کج فہمی ہو مجھے تو اپنے گھر میں کچھ اور ہی نظر آتا تھا اور اسی سے دل میں سوالات کا ہجوم ہوتا تھا۔ نانا۔ ابا۔ ماموں۔ خالو۔ پھوپا۔ بھائی ماشاءاللہ پورا کنبہ تھا۔ گھر میں رونق و برکت ہی برکت نظر آتی تھی۔ یا اللہ یہ سب کون ہیں؟ کیا یہ مرد نہیں! نہ کوئی خودغرض و مطلب پرست۔ سب کے سب انتہائی بردبار۔ ضبط و تحمل والے۔ غلطیوں سے درگذر کرنے والے۔ خوش اخلاقی محبت و خلوص کے پیکر۔ جفاکش اپنے پرائے سب کے ہمدرد۔ غم گسار۔ خدمت کے لئے تیار۔ اور آج بھی جو جوان میں سے سلامت ہیں اپنی تمام خوبیوں کے

ساتھ محبت و خلوص، ایثار و خدمت کے بے مثال مجسمے ہیں[1]۔

ہر انسان میں خیر و شر دونوں کی قوتیں ہیں۔ اور میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ صحیح تعلیم و تربیت ہر انسانی بچے کے کردار کو بلند کر دیتی ہے اور غلط ماحول و تربیت اس کو پستیوں میں گرا دیتی ہے۔ اس لئے ہمارا مردوں کے ظلم و ستم کا رونا ہماری کسی تکلیف کو دور نہیں کر سکتا۔ آخر ہم کیوں مردوں کو برا کہتے ہیں؟ ہمیں اس سے کونسی قوتِ عمل و راہنمائی ملتی ہے؟ اپنی غلطیوں کا اپنی ناکامیوں کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرانا کیا یہی بلندیٔ کردار ہے؟ میں نے تو جہاں تک غور کیا اپنے کو ہی غلط پایا۔ جب تک ہم اپنے فرائض کو نہیں سمجھتے اور جب تک ہماری ذہنی سطح بلند ہو کر ہمیں تعمیرِ قوم کی توفیق عطا نہیں ہوتی۔ ہم اسی طرح مردوں کے ظلم و جور کا رونا روتے رہیں گے اور قوتِ عمل کھوتے رہیں۔

کیا واقعی مرد فطرتاً ظالم ہوتے ہیں؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ خالقِ کائنات نے جن دو ہستیوں کو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بنایا معاذ اللہ[2] اس نے ایک کو ظالم و جابر بنا دیا؟

میری بہنوں اور بیٹیو! آپ کو ناگوار گذرے تو معاف فرمایئے لیکن اپنی محدود عقل و تجربہ کی بنا پر مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ یہ سب ہمارے اپنے ذہن کے تراشیدہ خیالات ہیں۔ مرد کچھ بھی نہیں ہوتے۔ جو کچھ ہم انہیں بنا دیتے ہیں وہ بن جاتے ہیں۔ وہ تو ہمارے ہاتھ میں گیلی مٹی کی طرح ہیں۔ جو نمونہ چاہا بنا لیا[3]۔ کاش ہم اپنی اس قوت سے اس عظمت سے واقف ہوتے تو آج ہمارے گھر جنت کا نمونہ بنے ہوئے ہوتے۔ مرد کو جنم دینے والی مرد کی پرورش کرنے والی عورت ہے۔ عورت پر ظلم مرد نہیں کرتا۔ اس میں نہ صلاحیتِ ظلم ہے نہ صلاحیتِ رحم و کرم۔ وہ تو جو عورت چاہتی ہے وہ ہی کرتا ہے اور لطف یہ ہے کہ کام کسی کا نام کسی کا۔ بد اچھا بد نام برا۔ آپ خفا نہ ہوں۔ ساس بہو کے جھگڑے۔ نند بھاوج کی لڑائیاں۔ دیورانی جٹھانی کی نوک جھوک۔ اس میں مرد کا دخل کہاں! اور جہاں تعددِ ازدواج ہے وہاں بھی عورت ہی عورت پر ظلم کرتی ہے۔ مرد تو کاٹھ کے الو کی طرح ہیں۔ گھر کے معاملات میں ان کی عقل و خرد علم و تجربہ ہنر و فن سب جواب دے جاتے ہیں۔ آنکھیں ہوتی ہیں لیکن دیکھ نہیں سکتے کان ہوتے ہیں لیکن سن نہیں سکتے۔

---

[1] آپ بیحد خوش قسمت تھیں کہ آپ کی پیدائش، پرورش اور تربیت ایسے عمدہ گھرانے میں ہوئی۔ اس سے پہلے ہمارے ہاں اکثر ایسے گھرانے ہوا کرتے تھے (اور اب بھی خال خال ایسے گھرانے ہیں) لیکن ہمارے معاشرہ کی عمومی حالت وہی ہے جس میں عورت پر بیحد مظالم ہوتے ہیں، جو کچھ ان بیٹیوں نے کہا تھا اس میں اسی عام حالت کا نقشہ پیش کیا گیا تھا۔ (طلوع اسلام) [2] خدا نے نہیں بنایا، صدیوں کے غلط تصورات اور روایات نے ایسا کر دیا ہے۔ ضرورت ان تصورات کو قرآنی تصورات سے بدلنے کی ہے۔ (طلوع اسلام) [3] غلط تصورات کے سانچوں میں ڈھلے ہوئے انسان ایسے نہیں ہوتے۔ (طلوع اسلام)

صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ سمجھ لیجئے۔ جو عورت نے بجا نظر آنے لگا جو اس نے بجایا وہ سننے لگے۔ اب یہ بات دوسری ہے کہ کہیں عورت ساس کے روپ میں حاوی ہوتی ہے اور کہیں بہو کے۔ کہیں نند کے کہیں بھاوج کے وغیرہ وغیرہ[له]۔ آپ اگر ٹھنڈے دل سے غور کریں تو ہر ظلم کی تہہ میں ہاتھ عورت کا ہی نظر آتا ہے۔ رسم و رواج کے لئے جن کی وجہ سے اکثر و بیشتر خاندانوں میں جھگڑے و فسادات ہوتے ہیں وہاں بھی عورت ہی کارفرما ہے۔ شادی بیاہ غمی خوشی غرض ہر موقعہ پر وہ ہی کیا جاتا ہے جو عورت چاہے۔ پڑھے لکھے سمجھدار تجربہ کار مردوں کو بھی یہی کہتے سنا ہے کہ بھئی کیا کریں گھر والے نہیں مانتے۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ ظالم کون اور مظلوم کون؟ غلطی کہاں سے شروع ہوتی ہے اور اصلاح کس طرح کی جائے؟ اپنے کو مظلوم کہنا کہاں تک ہمارے لئے درست ہے جس کے ہاتھوں میں قوموں کی تقدیر ہو وہ مظلوم کس طرح؟ ہاں ظالم کہیئے کہ اپنی غفلت و نادانی سے اپنا باغ خود اجاڑ رہے ہیں اپنی قوم کو خود تباہ کر رہے ہیں اور یہی وہ گناہ ہے جس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں۔ ہم سے اللہ تعالےٰ یہ سوال تو شاید ہی کرے کہ تم نے کس کس قسم کے فیشن ایجاد کئے اور کس کس طرح زیبائش و آرائش کا مظاہرہ کیا۔ کہاں کہاں حسن برق خرام کی بجلیاں گرائیں؟ لیکن یہ ضرور پوچھے گا کہ جو فرائض بیٹی بہن بیوی بہو ماں اور ساس بنا کر تمہارے ذمے کئے ان کو کہاں تک پورا کیا۔ بالخصوص ماں بنا کر جو عظیم مرتبہ دیا اس کی شکر گذاری میں کیا کیا۔ اور وہ وقت ہو گا جب کوئی نفس کسی دوسرے نفس کے کام نہ آئے گا نہ کوئی کسی کا بوجھ اٹھائے گا۔ يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝

عزیز بہنو! ہمارا معاشرہ گھروں کے مجموعے کا نام ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ مرد کی بہ نسبت عورت معاشرہ کی اصلاح زیادہ بہتر و حسن و خوبی سے کر سکتی ہے بلکہ میں پھر ایک بار یہی عرض کروں گی کہ صرف عورت ہی یہ کام کر سکتی ہے قدرت نے ہمیں عظیم قوتیں اور صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں۔ صرف بات اتنی ہے کہ ہم خود بے خبر ہیں اپنی قدر و قیمت خود ہی نہیں جانتے اپنے کو کمزور و کمتر سمجھتے ہیں اور اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے اپنی مظلومی کی داستان کو اپنے

له اور یہی سب سے بڑی مصیبت ہے کہ مرد ان کے ہاتھوں میں "کاٹھ کا اُلو" بنا رہتا ہے اور وہ جو کچھ چاہتی ہیں اس نو وارد بیوی کے ساتھ کراتی رہتی ہیں۔ اس کا بیشک ایک علاج یہ ہے کہ یہ ساس، نند، بھاوج، صحیح خیالات کی حامل ہوں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ عورت کے متعلق خود مرد کے تصورات بھی قرآنی ہوں۔ اگر یہ تصورات قرآنی نہ ہوں گے تو جہاں ساس، نند، بھاوج کوئی نہیں ہو گی، وہاں بھی مرد اپنے مظالم میں کمی نہیں کرے گا۔ جب سوال قرآن کریم کی روشنی میں دیکھا جائے انسانیت میں عورت کا صحیح مقام متعین کرنے کا ہے اسی سے اس مشکل اور نازک مسئلہ کا حل ہو سکے گا۔ (طلوع اسلام)

لئے وجہ ستائش سمجھا ہوا ہے۔

طبیب شفیق گذشتہ غلطیوں کے ماتم میں وقت ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ مرض کی تشخیص کرکے پوری محنت سے اصلاح احوال کی کوشش کرتا ہے۔ عورت کا بھی یہی مقام ہے۔ وہ طبیب شفیق بھی ہے اور معمار قوم بھی۔ ماں بہن بیوی بیٹی ہر صورت میں وقار کی مالک۔ گھر کی زینت و روشنی امن و سکون کی علمبردار خلوص و محبت کا پیکر دکھے ہوئے دلوں کا سہارا اور زندہ ملت سے عظمت حاصل کرنیوالی دیوی۔ لیکن آج ہم کیا ہیں۔ اس کا جواب آپ سب کو معلوم ہے۔ دل خون کے آنسو روتا ہے زبان پر بات لاتے ہوئے دکھ ہوتا ہے۔ ہم نے غلط آزادی اور غلط تعلیم کے نام سے اپنی عزت اپنا وقار سب کھو دیا۔ پہلے شمع خانہ تھے جس سے افراد خاندان روشنی پاتے تھے۔ اور اب شمع محفل بنکر پروانوں کے ہجوم میں بلبلوں کے نغموں میں اپنے آپ سے ہی بے خبر ہو گئے۔ ہمیں کرنا کیا چاہیئے ہم کر کیا رہے ہیں؟

ہماری برتری کھیل و تفریح کے میدانوں میں مقابلہ کرنے میں نہیں بلکہ افراد خاندان کے اندر امن و سلامتی قائم رکھنے میں معاشرہ کی بے لوث خدمت و اصلاح میں قوم کی پرورش و راہنمائی میں ہماری عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم علوم و فنون حاصل نہ کریں اور گھر کی چار دیواری میں قید ہو کر رہ جائیں۔ نہیں ہرگز نہیں علم حاصل کرنا ہنر میں یکتا ہونا لازمی ہے۔ علم کی روشنی و رہنمائی کے بغیر ہم کسی بھی فرض کو نہ سمجھ سکتے ہیں نہ حسن و خوبی ادا کر سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے زمانہ کی علمی سطح کا ساتھ بہرصورت دینا لازمی ہے۔ صرف ضرورت اس کی ہے کہ ہمارا ایمان باللہ تقلیدی نہ ہو بلکہ علیٰ وجہ البصیرت ہو۔ اور ہمارا ضابطۂ حیات قرآن پاک ہو۔ جو قدم اٹھے شمع قرآنی کی روشنی میں ہو۔ مجھے آیت تو یاد نہیں مفہوم یاد ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں کوشش کرتے ہیں تقویٰ اختیار کرتے ہیں اللہ ان پر اپنی راہیں آسان کر دیتا ہے[1]۔ ان کی رہنمائی فرماتا ہے اور ان کو اپنے نیک و فرماں بردار بندوں میں شامل کر لیتا ہے۔

فَادْخُلِی فِی عِبَادِی ۔ وَادْخُلِی جَنَّتِی ۔ (۸۹/۲۹)

فرمان ہوتا ہے کہ میرے بندوں میں شامل ہو جا میری جنت میں داخل ہو جا اور اس مقام عبدیت سے بڑھ کر اور کوئی مقام نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق خیر عطا کرے اور ہمیں ہدایت یافتہ و ہادی دونوں بنا دے۔ شکریہ۔

طلوعِ اسلام ہماری اس محترمہ بہن نے "مرد اور عورت" کے اہم مسئلہ کے ایک گوشے کو نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے یعنی اس گوشے کو کہ، گھروں کی زندگی میں پریشانیوں، ناچاقیوں اور بےچینیوں

---

[1] وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۔ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ۔ (۲۹/۶۹)

کی اکثر و بیشتر وجہ خود عورتوں کی جہالت ہوتی ہے۔ لیکن یہ جہالت براہ راست گھر کے اطمینان کو خراب کرتی ہے اور کہیں مرد اس سے متاثر ہو کر تباہی کا موجب بنتے ہیں۔ اگر عورت ——— ماں، بہن، بیٹی، بیوی، ساس، نند، بھاوج کے روپ میں، جہالت کی بجائے، قرآن کی عطا کردہ روشنی میں چلے، تو ان مصائب کا حل بآسانی مل جائے۔

لیکن اس کے ساتھ ضرورت تھی کہ اس مسئلہ کے دوسرے گوشے کو بھی اسی طرح نمایاں کیا جاتا۔ اور وہ یہ کہ صدیوں کی غلط روایات نے مردوں کے ذہن میں، عورت کے متعلق جو غلط تصورات جاگزیں کر رکھے ہیں جب تک انہیں دور نہیں کیا جائے گا، عورت پر بے حد مظالم ہوتے رہیں گے۔ یہ ہے عورت کی مظلومی کا وہ گوشہ جس کی ذمہ دار عورت نہیں بلکہ مرد ہے اور اس کا علاج یہ ہے کہ مرد کے دل سے یہ غیر قرآنی تصورات نکلے جائیں، اور عورت کو معاشرہ میں وہ مقام دیا جائے جو اسے قرآن نے عطا کیا ہے۔ یہ مقام مساوات کا ہے۔ نہ مرد کو، محض مرد ہونے کی حیثیت سے عورت پر کوئی فوقیت حاصل ہے۔ نہ عورت محض عورت ہونے کے اعتبار سے اس سے فروتر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری یہ محترمہ بہن آئندہ اس مسئلہ کے اس گوشے کو بھی قرآنی تعلیمات کی روشنی میں سامنے لائیں گی۔ طلوع اسلام۔

الفتنۃ الکبریٰ

مصر کے (نابینا) جید عالم، مورخ، محقق ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا معرکہ آرا کارنامہ جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ قرن اول کی تاریخ کے نازک ترین دور کی تصویر، اپنے موضوع پر لاجواب کتاب کا شگفتہ ترجمہ۔ قیمت چھ چھ روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

علم جغرافیہ اور قرآنِ پاک

(ڈاکٹر مس مریم حسان۔ لیکچرار اسٹر گرلز کالج گلبرگ۔ لاہور)

اس عنوان پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کا اولین مقصد عوام کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ علم جغرافیہ محض مدرسوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں درس و تدریس تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ جغرافیہ انسان اور کائنات کی ہر شے سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ چاہے کوئی انسان نفسِ مضمون سے آشنا ہے یا نہیں جغرافیہ سردی گرمی، طوفان و سکون، سیلاب بارش و خشکی۔ تجارت و انفرادی و اجتماعی جنگ و صلح کے مختلف پہلوؤں سے ہمہ طور دہمہ گیر و ہر آن کارفرما ہے۔

جغرافیہ کا عام مفہوم پہاڑوں، دریاؤں، شہروں اور ممالک کے ناموں کا انسائیکلوپیڈیا لیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں جغرافیہ انسان اور انسان کی ترقیات بہ تعلق ماحول کا مطالعہ ہے یعنی اس روئے زمین پہ خدائے قدوس نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا۔ اس انسان کے لئے دنیا اور زمین و آسمان پیدا کئے۔ تاکہ اس خالقِ حقیقی کا یہ شہکار انسان اس کائنات میں رہ کر اس سے استفادہ کرے۔ لہٰذا علم جغرافیہ کے متعلق خود کلام معجز بیان میں مذکور ہے۔

قُلِ انْظُرُوا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ——— (۱۰/۱۰۱)

"ان سے کہہ دو جو کچھ آسمانوں اور زمینوں کے اندر ہے۔ اس پر غور کرو۔ بات یہ ہے کہ جو ایمان نہیں لاتے ہیں (خدائے ذوالجلال کی باتوں سے منکر ہیں) ان کے لئے یہ آیات مفید نہیں اور نہ ہی ڈرانے والوں کا ان پہ کچھ اثر ہوتا ہے۔"

لاریب! جو دل عجائباتِ ربانی سے متاثر نہ ہو سکے۔ وہ کیونکر رحمتِ باری عزوجل کی صفات سے آشنا ہو سکے۔

خالق الخلائق کی حکمتِ کاملہ کے رموز سے شناسائی کا شائق نہ ہو سکے۔ تو وہ دل بہائم کے ہم پلہ ہے۔ قرآن عزیز کے درسِ فکر میں اللہ تعالیٰ نے یوں بھی فرمایا ہے۔

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ (پ ۹)

کیا لوگ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی میں غور نہیں کرتے۔ اور ان تمام اشیاء پر جن کو اللہ تعالےٰ نے پیدا کیا ہے

یہاں پر دیکھنے پہ ہی اکتفا نہیں۔ دیکھئے تو چرند پرند اور حشرات الارض بھی ہیں۔ یہاں پر نظر سے مراد محض آنکھ سے دیکھنا نہیں ہے۔ انسان کو دعوتِ فکر دی ہے کہ کائنات کی ہر اوقی و ادنیٰ شے پہ انسان دل و دماغ سے فکر کرے۔ جو لوگ اس درسِ قرآنی سے غافل ہیں۔ اور جن کی چشمِ بصیرت مشاہدۂ جمالیاتِ الٰہیہ سے عاجز و قاصر ہے۔ وہ نابینا ہونے کے مترادف ہے۔ ؎

کور بہ چشمے کہ لذت گیر دیدارے نہ شد

اس کتابِ مکنون میں جابجا دعوتِ فکر دی گئی ہے۔ ایک کامل لائحہ عمل انسان کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا مختصر سی آیات ایک ہمہ گیر وسعت کی حامل ہیں۔ ان میں کل کائنات کے متعلق واقفیت حاصل کرنے کا درس دیا ہے۔ مثلاً تمام نظامِ شمسی۔ زمینوں کے اندرونی و بیرونی خزائن، معدنیات، نباتات، حیوانات، زرعیات، ہر ذی روح و غیر ذی روح کے بود و نمود و نمود کے مطالعہ کرنے کا ارشاد و خالقِ ارض و سما نے اپنے بندوں کو دیا ہے تاکہ انسان مظاہراتِ قدرت کو زیادہ سے زیادہ مسخر کرتا رہے۔ اور اُن سے مستفید ہوتا رہے۔ آجکل انسان جو چاند اور مریخ تک فضائے بسیط میں کمندیں ڈال رہا ہے۔ یہ اسی درسِ قرآنی کے تحت محوِ تجسس ہے۔

انسان نے ابتدائے آفرینش سے اپنی سعئ پیہم سے ایک گونہ مدارجِ ترقی عبور کئے ہیں۔ وہ پتھر اور دھات کے زمانہ کا انسان، جو بامِ فلک کے نیچے اور فرشِ زمین پہ اکتفا کرتا تھا۔ وہ درختوں اور غاروں میں بسر کرنے والا انسان، گذر بیئے، اور چرواہے کی منازل طے کر کے آجکل کاخ مرمریں و فرش قالین پہ راحت پذیر ہے جنگلوں میں سرگرداں انسان آج گلزاروں میں محوِ گلگشت و فرحاں ہے۔ آئے دن اپنے آرام و آسائش کے طریقے رائج و ایجاد کر رہا ہے۔ اقبالؒ ان لامحدود انسانی کوششوں کو بیان کرتے ہوئے خدا سے یوں مخاطب ہے۔

تو شب آفریدی۔ چراغ آفریدم   سفال آفریدی۔ ایاغ آفریدم
بیابان و کوہسار و راغ آفریدی   خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم   من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

یعنی انسان رفتہ رفتہ قدرتی طاقتوں کو مسخر کر رہا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علم کا منبع تھے۔ آپ کی مقدس زندگی کا یہ مشن تھا کہ وہ بحیثیت معلم اعظم دا کبر انسان کو انسانی صلاحیتوں سے جولا محدود ترقیات کی حامل ہیں آشنا فرمائیں یعنی انسان کو وہ مرکزی حیثیت دیں جو کہ کتاب عزیز میں دی گئی ہے۔ اور یہ ہے جغرافیہ کا لب لباب۔ اسی نظریہ سے عرب و عجم کے جہالت پذیر ساکنوں کو درس بیداری دیا۔ علم حاصل کرنے کی ہر آن تلقین فرمائی تحصیل علوم پر اس درجہ زور دیا کہ تا قیامت تک حضور کا پیغام بصیرت افروز تمام نسلِ انسانی کے لئے شمع ہدایت رہے گا۔

چونکہ تعلیماتِ قرآنی خود تعلیم جغرافیہ کی ترویج کی حامل ہیں۔ اور بنی نوع انسان کو (RESEARCH) یعنی (SERCH FOR THE TRUTH) کی ترغیب دیتی ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں اسلام نے ایسے ایسے جغرافیہ دان پیدا کئے جن کی نکتہ آرائیاں اور قیاس آرائیاں تا قیامت اقوامِ عالم کے لئے سنگ میل کا کام دیتی رہیں گی۔ اس وقت نہایت اختصار کے ساتھ وہ شہرہ آفاق مسلمان جغرافیہ دانوں کا حال پیش کیا جاتا ہے۔ یہ جغرافیہ دان نہ صرف علم جغرافیہ کے لئے ہی شہرت پذیر ہیں۔ بلکہ یہ تمام مورخ، سیاح حساب دان اور منجم کی حیثیت سے بھی یاد کئے جاتے ہیں۔ رب رحیم کی عطا کردہ چشم بصیرت کی وجہ سے انھوں نے جمال قدرت کا مطالعہ کیا۔ حقائق کائنات کو دریافت، اور حکمت باری تعالیٰ کی باریکیاں سمجھیں یعنی کہ ان ماہرین جغرافیہ نے

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ

”زمین کی سیر کرو اور اس کو دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہے“

پر عمل کیا ہے۔

۱۔ المقدسی :-

ابو عبد اللہ محمد بن احمد المقدسی فلسطین کے باشندے تھے۔ بیت المقدس میں تولد کیا۔ مغربی ممالک میں ایک ممتاز جغرافیہ دان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ماسوائے ہندوستان، پاکستان، سپین تمام اسلامی دنیا کی سیر کی۔ اور آپ کی تصانیف اس بات کی شہادت ہیں کہ آپ نے اپنے دورِ سیاحی میں اعلیٰ زندگی کی حقیقتوں سے شناسائی حاصل کی جس ملک کی سیر کی وہاں کے علم و ادب پر مکمل عبور حاصل کیا۔ اور اپنے سفری تجارب اپنی کتاب احسان التقسیم فی معرفتہ الاقلیم میں درج کئے ہیں۔

مقدسی کے نزدیک جغرافیہ سائنسدانوں کی عدمِ توجہی کا شکار رہا ہے۔ اس لئے اس نے ایسا مواد اکٹھا کیا جو اس کے تجربات کا نچوڑ تھا۔ اور ان اقتباسات سے ہر ملک کے عوام کی طرز رہائش و اخلاق کا پتہ چلتا ہے۔

انھوں نے اپنی محنت شاقہ سے جغرافیہ کو ایک اہم ترین مضمون قرار دیا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس مضمون کو سائنسدانوں نے کچھ اہمیت نہ دی۔ میں اس مہم کے لئے تیار ہو گیا ہوں۔ وہ کام یہ ہے کہ مسلم دنیا کی جغرافیائی اہمیت کی واقفیت حاصل کر دوں۔ اس کے صحرا، سمندر، دریا، جھیلیں، مشہور شہر، گاؤں، آرام گاہیں۔ ذرائع آمد، جڑی بوٹیوں کے اصلی ماخذ، اشیائے درآمد و برآمد۔ مختلف ممالک کی زبانیں اور بود و باش سے واقفیت حاصل کروں۔"

علاوہ ازیں اس نے زمین کی قدرتی زرخیزی کا مطالعہ کیا۔ مقدسی کا یہ غائر مطالعہ جغرافیہ جدید مغربی جغرافیہ دانوں کے مطابق ہے۔

مقدسی کے نزدیک حصول علم جغرافیہ از حد ضروری ہے۔ سیاحوں اور سوداگروں دونوں کے لئے، بادشاہ و امیر سب اس علم کو حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں۔

۲۔ ابن بطوطہ:۔

محمد عبداللہ ابن بطوطہ نے تنجر کے شہر میں ۲۴ فروری ۱۳۰۴ء میں ایک عرب گھرانے میں ولادت پائی۔ مقدسی کی طرح ابن بطوطہ بھی ایک جید عالم، معروف سیاح، اور ماہر جغرافیہ تھے۔ انھوں نے ۱۳۲۵ء میں رخت سفر باندھا۔ شرقی اردن کے سیر حاصل سفر کے بعد وارد کابل ہوئے اور براستہ بولان جیکب آباد میں داخل ہوئے۔ یہاں پر چند ماہ قیام فرمایا۔ اور جیکب آباد کی شدید حدت جو کہ ضرب المثل ہے۔ کے متعلق یوں رقم طراز ہے۔

"تمازت آفتاب اتنی تیز ہوتی ہے کہ برداشت نہیں کی جا سکتی۔ گرم ہوا ہر قدم رکھنے سے روکتی تھی۔ اس سے بچنے کے لئے پانی سے کپڑے بھگو کر بدن پر رکھنے پڑتے تھے۔ جو حرارت کی شدت سے جلد سوکھ جاتے۔ اور پھر ان کو بدلنا پڑتا۔ کام کرنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ تمام وقت خوش گپیوں میں گذر جاتا۔"

بعد ازیں ملتان کا رخ کیا۔ اس قدیم شہر کے متعلق مفصل حالات قلم بند کئے۔ اس کی حیثیت مرکزی تھی۔ اور محمد تغلق شاہ دہلی کا لگان بھی یہاں اکٹھا ہوا کرتا تھا کیونکہ ایک مرکزی خزانہ تھا۔ لوگ تاجر پیشہ تھے۔ غیر ملکی تاجر کابل اور ایران سے یہیں آکر اپنا تجارت کا مال فروخت کیا کرتے تھے۔

ابن بطوطہ دہلی، مالدیپ، لنکا۔ جاوا، سماٹرا، اور ویتنام ہوتا ہوا جنوبی چین میں پہنچا جہاں سفر طویل کی

آخری منزل تھی۔ ابن بطوطہ نے کئی سفر اختیار کئے۔ جن کو ایک ضخیم کتاب بنام "تحفۃ النظار فی غرائب الامصار و عجائب الاسفار" یعنی "مختلف ممالک اور سفر میں آنکھ کے مشاہدات کا تحفہ" تدوین کئے ہیں۔

اب اگر دورِ حاضر کے پاکستانی ماہرین جغرافیہ کے رویہ اور مشاہدہ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ اس قدر دوررس نہیں ہیں۔ فطرت کا مطالعہ کرنے کے عادی نہیں۔ قدرتی وسائل و طاقتوں کو مسخر کرنے کی فکر سے بے بہرہ ہیں۔ اگر پاکستان کا جغرافیہ شناس عملی جغرافیہ دان ہوتا تو آج تقسیم اس غیر طبعی طور سے نہ ہوتی۔ پاکستانی جغرافیہ دان اپنے دریاؤں کا سرچشمہ قبیح ترین دشمن ہمسایہ ملک بھارت کو دے کر آرام سے بیٹھا ہے۔ دریاؤں کا مسئلہ۔ نہروں کا مسئلہ۔ آب دگیاہ کا مسئلہ یم و تھور کے مسائل ان کے نزدیک کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔

آج اگر پاکستان کے جغرافیہ دان متحدہ طور پر حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہو کر وطن کی بہبودی کیلئے آمادہ ہوجائیں تو موجودہ پالوس کن مسائل بہت جلد بہترین حل کے حامل ہوسکتے ہیں۔

مری کی گلپوش وادیوں میں ——

پرویز صاحب کی گراں مایہ تصانیف اور طلوعِ اسلام کی دیگر مطبوعات کے لئے پتہ ذیل پر رجوع فرمایئے

قریشی بک ڈپو —— لوئر بازار مری

مفت

دوا برائے دمہ و درد گردہ و پتھری

ملنے کا پتہ۔ حاجی محمد دین شیخ آئل فیکٹری متصل گنیش کھوپڑا ملز۔ لارنس روڈ کراچی

اپنے پتہ کا لفافہ بھیج کر دوا مفت منگالیں

ہماری تعلیم — قرآن کی روشنی میں

(پروفیسر حمیدہ جہاں خواجہ - لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج لاہور)

آج تعلیم سے متعلق چند سطور لکھنے میں کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے اور کتنا وقت اس پر صرف کیا کہ قرآن کی روشنی میں غور و فکر کرنے والوں کے سامنے کیا کہوں جس میں کوئی علم و حقیقت کی بات ہو۔ اپنے ماحول کا ذکر ہو اور مسائل کا حل قرآن کی مدد سے ہو۔ آپ کہیں گے کہ یہ کیسی معلمہ ہیں جن کی علمی کیفیت کی یہ حالت ہے کہ تاریخ کا مضمون پڑھانے کے باوجود جب کوئی حق کی بات کہنے کا موقع آیا تو گریز کی راہیں تلاش کرنی شروع کر دیں لیکن جہاں محقق اور پرویز صاحب جیسے عالم بیٹھے ہوں وہاں علم کی وسعتوں اور طریق تحقیق کا اعتراف کرنا ضروری ہے۔ قرآنی درس سننے سے کچھ یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ سنو، سمجھو اور کرو۔ بولو اس وقت جب قرآن کی دلیل سے دل و دماغ روشن ہو۔

میں اپنے معاشرہ میں جہاں کہیں اور جب بھی کوئی کمزوری یا خرابی دیکھتی ہوں خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی معاشی حالات سے متعلق ہو یا اقتصادی، سماجی ہو یا اخلاقی۔ ان سب کی ذمہ داری غلط مقصدِ تعلیم اور طریقِ تعلیم پر رکھتی ہوں۔ یہ فکر ہی مجھے یہاں لے آئی کہ انسانی معاشرہ کی تشکیل تعلیم اور صحیح خطوط کی تعلیم سے ہی ہو سکتی ہے۔ بغیر تعلیم کے افراد حیوانی سطح پر تو شاید زندگی بسر کر سکتے ہیں لیکن اشرف المخلوقات کی اجتماعی زندگی کا تو تصور بھی ممکن نہیں ہے۔ انسان کو تمام کائنات سے افضل ہونے کی دلیل بھی تو یہ ہے کہ اس میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت دی گئی ہے۔ تاکہ آزادی اور قوت ارادی کے ساتھ وہ اشیاء کا علم حاصل کرے۔ وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ...... (۲/۳)۔

ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم اس زمانہ کی پیداوار ہے جبکہ مغرب کی ایک ترقی یافتہ قوم حاکم ہونے کی وجہ سے یہاں کے انسانوں کو مشین کے کل پرزوں کی طرح اپنے مفاد اور کام کے لئے استعمال کرتی تھی اور اس کے لئے قوم کے کچھ افراد

کو تیار کرتی تھی جن کے ذمہ باقی لوگوں کا سنبھالنا بھی تھا۔ ان کے لئے پہلا سبق یہ تھا کہ تم اپنے حاکم کا حکم اور تابعداری قبول کرو اور ساری قوم کو یہ کھاؤ کہ وہ صرف کرہی وہ سکتے ہیں جس کا حکم دیا جائے۔ ایسا کرنا نیکی ہے اور اس سے ترقی کا راستہ کھلتا ہے۔ حاکم قوم کے مقرب بن جاؤ گے تو خان بہادری ملے گی۔ پیٹ بھی بھرے گا اور نچلے درجہ کی حکمرانی بھی ملے گی۔

عقل و فہم کو ماؤف کرنے، حاکم کا حکم ماننے اور دوسروں کی اندھی تقلید کرنے کے لئے تعلیمی پروگرام مرتب ہوا۔ اس سے کلرک، افسر، استاد، لیکچرار اور انسپکٹر صاحبان پیدا ہوئے، جن کے پاس اسناد تو تھیں لیکن آزادانہ طور پر اپنے دل و دماغ کا استعمال نہیں جانتے تھے کیونکہ فکر اور تدبر کو تو ممنوع قرار دیدیا گیا تھا۔

استاد کا کام اتنا ہی تھا کہ کتاب میں جو لکھا ہے وہ پڑھا دو اور طالب علم سے کہو کہ وہ اسے دہرا دے۔ اگر بالکل ان ہی الفاظ میں دہرا دیا تو طالب علم اعلیٰ نمبروں میں کامیاب ہوا۔ اس نظام کی نگرانی ان انسپکٹر صاحبان نے کی جنہیں ایک خاص قسم کی عینک دی جاتی تھی تاکہ وہ اتنا ہی کچھ دیکھ سکیں جو کچھ ان سے کروانا مقصود تھا۔ یہ نظام ایک فیکٹری کی مانند تھا جہاں سے فیکٹری کا مالک اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق پرزہ تیار کرتا ہے۔ اس میں ماحول اور لوگوں کی ضرورت اور بدلتے ہوئے حالات کا سوال ہی نہ تھا۔ یہ تعلیمی مشینری ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے وقت ہمیں ہمارے ترکہ میں ملی۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی خراب حالت میں یعنی اہلیت کے لحاظ سے کمزور اور تعداد میں کم۔ چنانچہ ان استادوں نے وہ بھی پڑھایا جو خود بھی نہیں پڑھا تھا۔ نصب العین تو سامنے تھا ہی نہیں۔ طالب علموں نے امتحان کو مقصد مان کر کل وہ ذرائع اختیار کیے جس سے امتحان میں کامیابی تو حاصل ہو جائے علم اور قابلیت سے کوئی سروکار نہ ہو۔ مختصر نوٹس اور سوالات کے جوابات یاد کرنے شروع کر دیئے یا جوابات کو نقل کر کے امتحانات میں لے جانے لگے۔ اسی سال کی بات ہے کہ ایک اعلیٰ معیاری اسکول میں پانچویں جماعت کے اٹھارہ طالب علموں نے امتحان میں نقل کرنے کی کوشش کی۔ اس سب کے باوجود امتحان کے نتیجے ہر سال خراب سے خراب نکلنے لگے یعنی ۴۰، ۳۰، ۲۰ اور ۳۵٪ سے اوپر نہیں جاتے۔ پھر بھی معیار تعلیم پست ہے اور روز بروز گرتا جا رہا ہے۔ اسکولوں میں داخلہ دشوار گذار ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لئے سفارش، خوشامد اور دیگر ذرائع استعمال کئے جانے لگے لیکن ایسے بھی ہیں جنہیں یہ طریق بھی نہیں آتا۔ وہ بیچارے بیچارے ہی رہے۔ دوران کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بالآخر کیا کیا جائے۔ جھوٹ اور خوشامد آتی نہیں اور ترقی کے لئے ماحول سازگار نہیں۔ آہ و زاری شروع کر دی۔ اسے بھی روکا گیا۔ اس سے کردار میں ایک بزدلی اور لاچارگی پیدا ہوگئی۔ ان کمزوریوں کے ساتھ بے جان انسانوں نے جسمانی خوراک حاصل کرنے کی مہم کو ہی اپنی زندگی کا منتہیٰ سمجھ لیا۔ یہاں تک بات رہتی تب بھی کچھ بنتا کہ زرعی ملک میں خوراک کی افراط ہوتی اور جسمانی طور پر توانا لوگ تو ہوتے۔ یہ بھی نہیں ہوا اس لئے کہ مذہب کے علمبرداروں

کی طرف سے انھیں یہ سبق ملنے لگا کہ اپنی حالت پر شاکر اور قانع رہو کہ تمہاری قسمت میں یہی لکھا ہے قسمت بدلنا تمہارے بس کی بات نہیں۔ اس پر اگر زیادہ سوچو گے اور سوال کرو گے تو مذہب سے خارج اور جہنم میں جاؤ گے۔ اس لئے نہ جاننا نہ سمجھنا۔ نہ سوچنا۔ نہ دیکھنا۔ جو کچھ کرتے آئے ہو وہی کرتے رہنا۔ اور اپنی قسمت پر شاکر رہنا عین مذہب کے مطابق ہے۔ یہ اتنا بڑا ملک جس میں کائنات کی طرف سے ہر شے کی افراط، ہر قسم کے موسم، ہر قسم کی پیداوار، سورج کی کرنوں کی وہ بھرمار کہ انسان کی ہر ضرورت کے لئے طاقت مہیا کر دے لیکن یہ تو اس وقت ہو جب انسان علم حاصل کرے اور ان چیزوں کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کرے لیکن انسانوں کی حالت حیوانوں سے بھی بدتر۔ بھوکے ننگے بے گھر جاہل مفلس پسماندہ۔ یہ سب اس لئے کہ بے علم رہو۔ غور و فکر سے نئی راہیں تلاش نہ کرو، ورنہ لامذہب ہو جاؤ گے۔ تکلیف اور دکھ تو قسمت میں لکھا ہوا ہے اسے ہر حال آ کر رہنا ہے۔ ان باتوں پر بغیر سمجھے سوچے یقین کرنا بھی تو ایمان لانا ہے۔ یہ چلے سنے تھے۔ بولے تھے پڑھے اور شاید امتحان میں لکھے بھی تھے۔ لیکن اب تو یہ حال ہے کہ اپنی اس جہالت پر اپنے آپ کو «کافر» کہنے کو دل چاہتا ہے لیکن یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ انکار کرنے والا بھی تو کچھ سمجھ کر انکار کرتا ہے۔ ہم تو وہ بھی نہیں کرتے تھے۔

ذرا قرآن کی اس آیت پر تو غور کیجئے۔ فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ۔ (۴۷/۱۹) علم حاصل کرو کہ بیشک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ تم اس حقیقت کو اچھی طرح جان لو کہ خدا کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ یہ جان لینا علم کے بغیر کس طرح ممکن ہے۔ لیکن یہ پڑھ کر آنکھوں سے آنسو نکلنے لگتے ہیں۔ دل کانپنے لگتا ہے۔ سر جھک جاتا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کے کہنے والوں کی یہ حالت ہے کہ ہم ان الفاظ کو دہراتے ہیں کیونکہ مسلمان ماں باپ کے ہاں پیدا ہوئے تھے۔ دل چاہتا ہے کہ قوم کی زندگی کے اوراق پلٹ دیئے جائیں اور نئے سرے سے زندگی شروع کی جائے۔ یہ تو ممکن نہیں لیکن یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ آنے والی نسل کے لئے تعلیم کی ابتداء اس سے ہو کہ فاعلم انہ لا الٰہ الا اللہ۔ اس کے بعد بھلا اس امت میں کوئی جاہل رہ سکتا ہے؟ قرآن تو جگہ بہ جگہ علم اور حکمت کی راہیں دکھاتا ہے لیکن یہ تو جب ہو جب ہم قرآن کو سمجھ کر پڑھیں۔ قرآن کہتا ہے کہ۔ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ۔ (۳۹/۹) کیا وہ لوگ جو صاحبان علم ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے ہیں کبھی دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ پھر اس کا ارشاد ہے کہ اللہ سے صحیح طور پر خشیت وہی لوگ رکھتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔ إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰؤُا۔ (۳۵/۲۸)۔ صفاتِ خداوندی کو سمجھنے اور یہ کہنے کے لئے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں علم کی گواہی کی ضرورت ہے۔ گویا یہ وہی کہہ سکتا ہے جو علم رکھتا ہے۔ شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلٰئِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ (۳/۱۸)۔ اللہ کے احکامات اور اس کی بنائی چیزوں کو سمجھنے کے لئے علم غور و فکر اور تدبر کی ضرورت ہے۔ بغیر اس کے اللہ کو نہیں پہچانا جا سکتا۔

اس ملت کی حالت تو دیکھو جو قرآن پر ایمان رکھتی ہے، اور محمدؐ کو اپنا رسول مانتی ہے۔ اس کے نام لیواؤں کی جہالت کا یہ عالم کہ پچاسی فی صد وہ اشخاص ہیں جو انگوٹھا لگا کر کسی معاہدہ، رسید پر اپنے انسان اور وہ بھی مسلمان انسان ہونے کا ثبوت دیتے ہیں! بھلا بتایئے تو سہی کہ یہ امت اُس رسولؐ کی امت کہلانے کی مستحق ہے جسے سب سے پہلے یہ حکم دیا گیا تھا کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۔ (۹۶/۱-۵) - قرآن علم کی تہ تک پہنچنے کی تلقین کرتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ وہ لوگ جو سطحی چیزوں پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں وہ گہری نگاہ رکھنے والوں کی طرح بعد کے نتائج کو سمجھ نہیں سکتے خواہ وہ اس زندگی سے متعلق ہوں یا اس کے بعد کی زندگی سے۔ یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ۔ (۳۰/۷)

حقیقت یہ ہے کہ علم کی کوئی انتہا نہیں۔ کائنات کا علم۔ انسان کی اپنی ذات کا علم۔ اور پھر تمام علوم میں تحقیق کرتے جانا۔ ان تمام امور کی طرف قرآن دعوت دیتا ہے۔ اور اس کا طریق بھی بتاتا ہے۔ ہر شخص تمام علوم کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتا اس لئے یہ کرو کہ جو جس کی اہلیت اور صلاحیت رکھتا ہے اس علم میں غوطہ زنی کرے اور اپنی کوشش کے ماحصل کو نوع انسان کی بہبود کے لئے عام کر جائے۔

تحقیق اور تجربات سے علم کو آگے بڑھانے کی تعلیم قرآن سے ملتی ہے۔ یہ بات نہیں کہ آج علم جس سطح تک پہنچ چکا ہے وہ اس کی آخری حد ہے۔ اس کے بعد اس میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ یا ایک فرد نے جس قدر علم حاصل کر لیا ہے کوئی دوسرا اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ علمی تحقیقات کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہنا چاہیئے۔ فَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ۔ (۱۲/۷۶)۔

غور کیجئے کہ جس قوم کے پاس اس قسم کی خداوندی راہ نمائی ہو کیا انہیں اس کی ضرورت ہے کہ غیر ملکوں اور دوسری قوموں کے لوگ آ کر اسے بتائیں کہ تم علم حاصل کرو یا وہ ہمیں آ کر یہ بتائیں کہ تمہاری تعلیم کا مقصد و منتہیٰ یہ ہونا چاہیئے! کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہماری نگاہیں مغرب کے ترقی یافتہ ممالک کی طرف اٹھتی ہیں کہ وہاں سے کوئی ماہرِ تعلیم آئے اور ہماری مدد کرے تاکہ ہم بھی علم کے میدان میں کچھ دریافت کر سکیں۔ وہ پھر یہاں کے ماہرین تعلیم سے دریافت کرتا ہے کہ تمہاری ملت کا فلسفہ حیات کیا ہے۔ تم لوگوں کو کیا بنانا چاہتے ہو۔ انہیں کس قسم کی اجتماعی زندگی گزارنے کی تربیت دینا چاہتے ہو۔ پہلے اس کا تعین کر دو تو آگے طریق بتائیں اور کتابیں مہیا کریں۔ تو اب یہ حال ہے کہ ہم اپنا مقصدِ حیات متعین کرنے کے لئے بھی ان کی طرف ہاتھ پھیلا دیتے ہیں۔ وہ اپنی جمہوریت، نظریۂ قومیت۔ فلسفۂ حیات کو سامنے رکھ کر ہمیں تعلیم کا طریقہ بتاتے ہیں اور ہم بہت خوش ہوتے ہیں کہ انہوں نے کیسی اچھی اچھی باتیں ہمیں بتائی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ دوسروں کی تحقیق و ایجادات سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ لیکن اپنا مقصدِ حیات متعین کرنے میں دوسروں کی تقلید کرنا، یہ تو اجتماعی خودکشی ہے۔ بالخصوص ایک ایسی قوم کے لئے جو خدا کی دی ہوئی ابدی راہ نمائی پر ایمان رکھنے کی مدعی ہو

میری آپ حضرات سے استدعا ہے کہ آپ قرآن کو سمجھکر عمل کرنے کی دعوت عام دیجئے۔ دین کو سمجھنے سمجھانے میں مدد دیجئے۔ تاکہ عام لوگ مقصدِ حیات سے باخبر ہو جائیں۔ اپنا تعلیمی ادارہ قائم کیجئے۔ جہاں آزادانہ طور پر سوچ و فکر کی تعلیم و تربیت ہو اور سائنس کا علم عام ہو۔ قرآنی اصول کے مطابق زندگی گذاری جائے۔ اچھی اور معیاری کتابیں لکھیئے۔ اس سلسلے میں پرویز صاحب نے بڑا قابلِ قدر کام کیا ہے اور اس کا سلسلہ جاری ہے۔

جب علم آتا ہے تو اپنے حقوق کا پتہ چلتا ہے اور بیداری پیدا ہوتی ہے۔ معیارِ زندگی بدلتا ہے۔ اقتصادی حالات میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ اور مجھے تو بس اس طرح اسلامی معاشرہ کی داغ بیل پڑنے کی امید دکھائی دیتی ہے۔ خدا ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

دینی مدارس کی تاریخ اور جائزہ

مغربی پاکستان کے دینی مدارس کی تاریخ ساڑھے آٹھ صد (۸۵۰) صفحات پر مشتمل پہلی بار دو سال قبل شائع ہوئی تھی۔ اپنی نوعیت کی یہ پہلی کوشش تھی۔ ملک اور بیرون ملک میں اس خدمت کو سراہا گیا۔ اس وقت دو صد کے قریب مدارس کے کوائف مہیا نہ ہو سکے تھے۔ نیز اس درمیانی عرصہ میں متعدد نئے مدارس قائم ہو گئے ہیں۔ اور ترقی کے کئی مراحل طے کر چکے ہیں۔

ان حالات میں ضروری ہو گیا کہ تمام قدیم و جدید مدارس کی تاریخ از سرِ نو مرتب کی جائے مغربی پاکستان کے جن دینی مدارس کے پتے موجود تھے انہیں تیرہ صد سوالنامے روانہ کئے جا چکے ہیں۔ ابھی تک جن مدارس کو نہ ملے ہوں وہ اس پتہ سے بلا قیمت طلب فرمائیں۔

حافظ نذر احمد جنرل سکریٹری مسلم اکادمی ۱۸۔ محمد نگر۔ لاہور

(۲) وہ مقالے جو لکھی ہوئی موصول ہوئیں اور کنونشن میں پڑھے نہیں گئیں

امریکہ سے

محترمہ بہن سعیدہ اختر، پروفیسر لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج لاہور نے پچھلے سال کنونشن میں اپنا مقالہ پڑھا تھا جو بہت پسند کیا گیا تھا۔ اس سال وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے امریکہ گئی ہوئی ہیں۔ وہاں سے وہ تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے مقالہ تو نہیں بھیج سکیں، البتہ ایک تفصیلی خط لکھا ہے جو مقالہ کی جگہ لے رہا ہے۔ وہ بہ تشکر درج ذیل کیا جاتا ہے۔

طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر سے متاثر ہونے والوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا کے کسی گوشہ میں جائیں، اور کسی کام کے لئے جائیں، وہ اپنے کام کے ساتھ ساتھ قرآنی فکر کے مبلغ بھی بنے رہتے ہیں، یہی کیفیت محترمہ بہن سعیدہ اختر کی بھی ہے۔ وہ وہاں اپنے ہر دائرہ اثر میں قرآنی تعلیم کو پیش کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی مزید توفیق عطا فرمائے۔ (طلوعِ اسلام)

محترم پرویز صاحب۔ السلام علیکم!

آپ سے میرا وعدہ تھا کہ کنونشن کے لئے مضمون لکھ کر بھیجوں گی مگر یہاں دل و دماغ کو فرصت کہاں! امریکہ ایک کھلی ہوئی کتاب بن کر میرے سامنے ہے اور اسے دیکھنے اور سمجھنے میں ذہنی اور احساساتی طور پر اس درجہ مصروف ہوں کہ اپنی پڑھائی بھی فی الحال دماغ میں نہیں سماتی۔ آپ کا درس سننے سے پیشتر قرآن کا پڑھنا صرف کارِ ثواب تھا۔ آپ کے درس نے اس کے الفاظ میں مفہوم اور زندگی پیدا کی۔ یہاں آکر جو دیکھا تو قرآنی تعلیم کے بیشتر گوشے سراپا عمل آنکھوں کے سامنے ہیں۔ قدرت کی ہر قوت ان کے آگے سربسجود۔ یہیں آکر اندازہ ہوتا ہے کہ انسان بیسویں صدی میں سے گذر رہا ہے۔ اور اس خطۂ زمین پر اب مادی ترقی کی گنجائش باقی نہیں رہی، اسی لئے تو وہ چاند تک پہنچنے کے

رستے ڈھونڈھ رہا ہے! اپنے ہاں لوگوں کو قرآن پڑھتے، سجدے کرتے اور تسبیح کے دانے گنتے، اور پھر ان کی زندگی کو اس عبادت کے مقصود سے یکسر مختلف دیکھ کر مسجدوں سے جی بھر گیا تھا۔ یہاں ہر گوشے میں خدائی قوتوں کو اتنی ان کے تحت جوہر کا دیکھ کر اس خالق برحق کے سامنے سجدہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اور یہاں اپنی قسم کے سجدوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ پروفیسر صاحب اور چار مرتبہ ان لڑکیوں کے ساتھ گرجے بھی چلی گئی تھی یہ دیکھنے کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ یہاں مذہبی تعلیم سکولوں میں نہیں دی جاتی۔ ہر شخص کسی نہ کسی چرچ کا ممبر ہوتا ہے اور اکثر و بیشتر لوگ اتوار کے روز چرچ ضرور جاتے ہیں۔ سارا دن گرجوں میں کوئی نہ کوئی پروگرام ہوتا رہتا ہے۔ کسی پروگرام کو (Sunday school) کہتے ہیں، کسی کو (Morning Prayer)۔ اس کے علاوہ کالج اور یونیورسٹی کے طالب علم بھی ان پروگراموں میں حصہ لیتے ہیں۔ کہیں کہیں عورتیں بچوں کو ساتھ لاتی ہیں، جہاں بچوں کے لئے خاص پروگرام علیحدہ ہوتا ہے۔ گرجے کے پادری کی علمی سے اعلیٰ ڈگری لیتی ہوتی ہے۔ شام کے وقت گرجے میں میٹنگ ہوتی ہے یا (Dinnar) ہوتا ہے۔ ان تمام پروگراموں کے دوران میں کئی بار پیالے گھومتے ہیں۔ اور لوگوں سے چندہ جمع کیا جاتا ہے، ہزاروں روپیہ اس انداز میں جمع ہوتا ہے اور باہر کے ممالک میں مشنری کاموں پر خرچ کیا جاتا ہے۔ بے ساختہ منہ سے تحسین نکلتی ہے لیکن دل کڑھتا رہتا ہے۔ سوچتی ہوں، اللہ کا گھر ان گرجوں کو کہا جائے یا اپنی مسجدوں کو۔ اللہ کا گھر تو بہرحال مسجدوں ہی کو بنتا ہے جہاں ایک خدا کا نام لیا جاتا ہے لیکن ان عیسائیوں نے گرجوں سے وہ کام لینا شروع کر دیا جو مسلمانوں کو اپنی مسجدوں سے لینا تھا۔ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ قرآن اے جا کر ان کے ہاتھوں میں دے دوں کہ تم ہی "مسلمانوں" کی نہیں اپنے خدا کی کتاب سمجھ کر پڑھو، مسلمانوں کو اس کے "وظیفے" سے کچھ نہ ملا۔ تمہارے عمل سے یہ قرآن دنیا پر چھا سکتا ہے۔۔۔!

ایک سکول میں نویں جماعت کے لڑکے نے مجھ سے پوچھا کہ پاکستان میں (Communism) کا رجحان کیسا ہے۔؟ کہنے کو تو میں نے کہہ دیا کہ مسلمانوں کے پاس اپنا (Code of Life) اتنا بلند اور مکمل ہے کہ وہ (Communism) کی طرف جا ہی نہیں سکتے لیکن جب اس نے حیرت سے میرا منہ دیکھتے ہوئے پوچھا کہ پاکستان میں کونسا نظام رائج ہے؟ تو سمجھ میں نہ آیا کیا جواب دوں۔۔۔!

ان امریکنوں کو خدا نے اتنا کھانے کے لئے دیا ہے کہ ہمارے ہاں عام گھرانوں میں جتنا سارے خاندان کے لئے پکتا ہے اتنا یہاں ایک شخص ایک وقت میں کھا جاتا ہے۔ کھانے کے ساتھ پانی پینے کا تو رواج ہی نہیں۔ دودھ پیتے ہیں۔ اور ہر شخص دو تین گلاس دودھ ایک وقت میں پی جاتا ہے۔ کیا یہ وہ دودھ کی نہریں نہیں ہیں جنہیں بے عمل مسلمان جنت میں دیکھنے کے خواب دیکھتا ہے۔؟ کھانے کی اس افراط کے باوجود میں نے یہاں کسی شخص کو کبھی خدا کا شکر ادا کئے بغیر اور دعا پڑھے بغیر کھاتے نہیں دیکھا۔ نہ کسی بڑی سے بڑی محفل میں، نہ کسی چھوٹے سے چھوٹے گھر میں۔ پچھلے ہفتہ کی شام کو

یہاں (International Club) میں تین سو لوگوں کا کھانا تھا، لوگ مختلف کمروں میں بیٹھے تھے۔ جب سب میزوں پر بیٹھ گئے سب نے ایک ساتھ سر جھکایا اور مائکروفون پر دعا پڑھی گئی۔ کچھ روز ہوئے کسی کے گھر دوپہر کے کھانے پر گئی تھی۔ اُن کی دو بچیاں ہیں چھ چھ برس کی۔ کھانے کی میز پر باپ نے بچی سے کہا کہ آج ہمارے ہاں مہمان آئے ہیں تم دعا پڑھو۔ اُس چھ سالہ بچی نے اتنی خوبصورت دعا پڑھی کہ میں عش عش کر اٹھی۔ اور پھر کھانے کے بعد ان دونوں بچیوں نے برتن اٹھائے آئس کریم لاکر سب کو دی۔ اور بعد میں کرسیاں اٹھا کر جہاں کی تھیں وہاں رکھیں اس طرح یہ لوگ کام کرنا سیکھتے ہیں۔

یہاں ¾ کام مشین کرتی ہے اور ¼ کام انسان کرتا ہے۔ مگر ¼ کام بھی اتنا ہوتا ہے کہ ہر شخص کام کرتا ہے۔ کوئی قوت کام کے رستے میں حائل نہیں ہوتی جس جگہ میں ہوں، سال میں پانچ مہینے برف باری ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں پہاڑی لوگ مہینوں کا راشن لے کر گھر کے ایک کمرے میں (جہاں گائے بھینس بھی ہوتی ہیں) گھس جاتے ہیں۔ اور سوکھی روٹی کے ساتھ اگر نمک کھانے کو مل جائے تو اسے اللہ کی دین سمجھ کر صبر شکر سے کھا لیتے ہیں۔ یہاں برف گرتی رہتی ہے اور کسی کے دماغ میں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ کام بند ہو سکتا ہے۔ یونیورسٹی یہاں رات نو بجے تک کھلی رہتی ہے اور پڑھنے پڑھانے کا کام مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ ہر شخص کو اپنا کام، اپنا مقام، اپنا حق اور اپنا فرض معلوم ہے کوئی اپنے کام سے غافل نہیں اور کوئی کسی کے رستے میں حائل نہیں ہوتا۔ عورتوں میں خود مختاری اور اپنی ذات کا شعور انتہا درجے کا ہے۔ یوں لگتا ہے امریکہ عورتیں چلا رہی ہیں۔ دفتر، دکانیں، سٹور، ہوٹل، سکول، کالج سب جگہ عورت کا جبر زیادہ ہے۔ جہاں مرد کام کرتے ہیں ان کے پیچھے بھی کہیں عورت کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

بہت سی باتیں یہاں کی بُری بھی ہیں۔ اور جو بُری ہیں وہ بھی انتہا کو پہنچی ہوئی ہیں۔ یہ امریکن جو کام بھی کرتے ہیں جی کھول کر کرتے ہیں۔ سوچتی ہوں اگر یہ قوم سؤر کا گوشت کھانا چھوڑ دے تو شاید وہ جنسی بے حیائی کم ہو جائے جو اپنے عروج کو پہنچنے والی ہے۔ مگر قرآن کی یہ آیت اور سورۃ النساء کی چند آیات ابھی ان کی سائنس کی لیبارٹری میں نہیں آئی ہیں۔ اگر ان تک کہیں قرآن پہنچ جائے تو یقین مانیئے پرویز صاحب اس زمین پر جنتی معاشرے کے جس قدر حسین نقشے آپ پیش کیا کرتے ہیں وہ سب آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ ہم لوگ تو اس قوم سے صدیوں پیچھے رہ گئے ہیں۔ اور جب ہم لوگ یہاں تک پہنچیں گے تو یہ قوم چاند کی بلندیوں پر پہنچ کر اس سرزمین کی "دوزخ" پر مسلمانوں کو "قرآن بغلوں میں دبائے" چلتے ہوئے دیکھ کر مذاق اُڑایا کرے گی۔ مسلمان کے ہاتھوں سے دین و دنیا دونوں نکل گئے۔ دل خون کے آنسو روتا ہے۔ کبھی کبھی بڑی بے چین ہو جاتی ہوں۔ میرے تو دل و دماغ کو یہاں چین نہیں ملتا۔ زندگی کی سب سہولتیں اور آرام میسر ہیں۔ علم و معلومات میں اضافہ کر رہی ہوں لیکن اتنی اجنبیت اور غیریت ہر شے سے ٹپکتی ہے کہ

جی نہیں لگتا۔

ہماری ہر شے مستعار، ہر شے ادھار۔ مسلمان اب ان فرنگیوں سے سیکھنے آتے ہیں اور پھر بھی کچھ نہیں سیکھ کر جاتے۔ جو کچھ سیکھ کر جاتے ہیں وہ ہمیں اور تباہ کر دینے والا ہوتا ہے ــــــ اب تو جی بھر آیا ہے۔ زیادہ لکھا نہیں جا رہا کل امتحان بھی ہے اس کی تیاری کرنی ہے۔ باقی آئندہ لکھوں گی۔

یہ قوم نہ کافر ہے نہ منکر، نہ منافق اور نہ مومن۔ سمجھ میں نہیں آتا اسے کیا کہوں، کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی یہ سب کچھ ہے۔ اور ہم اللہ کے پیارے۔ اُس کے پیارے نبیؐ کی پیاری امت ہونے کے مدعی۔ اپنے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں۔ اللہ اکبر ــــــ ہائے کاش۔ ہمیں عمل کی توفیق مل جائے یا ان لوگوں کو قرآن!

دعاؤں کی متمنی :- سعیدہ

علامہ احمد امین مصری (مرحوم) کی
علمی اور تاریخی کاوشوں کا شاہکار

فجر الاسلام

جسے مولانا عمر احمد عثمانی نے اردو زبان میں منتقل کیا

اس دور کی علمی حرکات اور تہذیبی کیفیات کا تفصیلی جائزہ جب آفتاب اسلام کی جلوہ باریوں نے بزم انسانی کو منور کیا

ضخامت نو سو صفحات ــــــ قیمت آٹھ روپے

ملنے کا پتہ:- میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ، ۲۷ - بی - شاہ عالم مارکیٹ - لاہور

علماء کرام سے گذارش

ابھی میں بچہ ہی تھی کہ پہلی بار میرے ذہن میں دینِ اسلام کے حق ہونے کے بارہ میں ایک شبہ پیدا ہوا کہ سب مذاہب کے لوگ اپنے مذہب کو درست خیال کرتے ہیں۔ اور دوسروں کے مذہب کو غلط خیال کرتے ہیں اور اسی طرح مسلمان بھی خود کو حق پر سمجھتے ہیں۔ تو کیا خبر کہ صحیح مذہب کونسا ہے؟ اور سب ایک دوسرے کو غلط سمجھتے رہتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ایسے ماحول میں تھی کہ مجھے ان سوالات کا جواب مل گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اسلام ہی صحیح دین ہے۔

لیکن بچپن کی یہ الجھن اب ایک اور روپ دھار بیٹھی ہے۔ پہلے تو یہ الجھن تھی کہ آخر کونسا مذہب برحق ہے۔ اور اب یہ الجھن پیدا ہوئی کہ اسلام کے بے شمار فرقوں میں کونسا فرقہ حق پر ہے؟ ایک خدا اور ایک رسول (صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم) کے نام لیوا اور اتنے فرقے اور اختلافات کہ ایک مخلص مسلمان کا ذہن سوچتے سوچتے چکرا جاتا ہے۔ کہ آخر کونسے عالم کی تفسیر اور اسلام کی تشریح درست ہے۔ اگر سائنس، واقعات کے متعلق کوئی غلط نظریہ قائم کرے تو اس کا اتنا نقصان نہیں ہوتا لیکن ایک مسلمان کی دنیا و آخرت دین کے بارے میں غلط نظریات قائم کرنے سے برباد ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے ان تفرقات اور ان اختلافات نے مجھے بہت پریشان کیا۔ اس کے علاوہ عالم جو دین کا ستون اور ملتِ اسلامیہ کو صحیح راہ پر گامزن کرنے کے اہل سمجھے جاتے ہیں اُن کا آپس میں جھگڑنا، برا بھلا کہنا، نیتوں پر حملہ کرنا اور دوسرے کے خیالات کی غلط ترجمانی کرنا سخت عجیب اور پریشان کن لگتا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک عالم پر اتنا بھی اعتماد نہ ہو کہ وہ کسی کا نقطۂ نظر درست پیش کر سکتا ہے۔

علماء ایک دوسرے پر بے راہ روی کے فتوے لگاتے ہیں۔ گویا دینِ اسلام آن میں سے ہر ایک کی متروکہ جائیداد ہے۔ اور وہ اپنا قلیم منظور کرانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور میری سٹدم کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب میری ایک کمیونسٹ

ہم جماعت ہمیشہ اسلام کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتی ہیں کہ تم مسلمان تو خود ہی اتنے فرقوں میں بٹے ہوئے ہو۔ کوئی اسلام کی تشریح کچھ کرتا ہے کوئی کچھ۔ آخر ذیل کے سامنے تم کونسے فرقہ کے اسلام کو پیش کر سکتے ہو۔ اس وقت علماء پر بہت دکھ ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک ملت کو اتنے حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور اس سے بھی زیادہ افسوس یہ سوچ کر ہوتا ہے کہ ملتِ اسلامیہ مذہبی فرقوں، ملکی تعصب، نسلی تعصب، صوبائی تعصب، ذات پات کے تعصب میں بری طرح بٹ کر بے اتفاقی پیدا کر رہی ہے اور ہر کوئی خود کو دوسرے سے برتر سمجھ رہا ہے۔

کئی سال سے یہ خیالات میرے ذہن میں طوفان بپا کر رہے تھے۔ مجھے اس سوال کا جواب تو مل گیا کہ اسلام ہی دینِ حق ہے مگر یہ اب تک نہیں مل سکا کہ آخر کونسا فرقہ درست ہے؟ اگر میں کسی کے سامنے فرقہ بندی اور دوسرے تعصبات کے خلاف بات کرتی ہوں تو کوئی میری بات کی تائید نہیں کرتا بلکہ اکثر یہی کہتے ہیں کہ اختلاف ملنے بری چیز نہیں، اور فرقے تو پیدا ہوتے ہی ہیں۔ مگر میں اب تک قائل نہیں ہو سکی کہ جب خدا نے سب کو ایک ملت قرار دیا ہے اور فرقہ بندی سے ہمیں ہر لحاظ سے نقصان پہنچ رہا ہے تو پھر یہ کیسے بری چیز نہیں۔[1]

اتفاق سے پرویز صاحب کے لٹریچر میں مجھے پہلی بار فرقہ بندی کے خلاف اپنے خیالات کی تائید ملی۔ اور میں نے شکر کیا کہ کوئی صاحبِ علم شخص تو اس فرقہ بندی سے نالاں ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ پرویز صاحب کے خیالات سو فیصدی درست ہیں یا سو فیصدی غلط۔ میں بہرحال یہ ضرور کہہ سکتی ہوں کہ میرے ذہن میں جو خیالات اور سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کا جواب انہی کی تحریروں سے ملتا ہے۔

اپنی اس الجھن کہ کون حق پر ہے اور کون غلطی پر کا جواب مجھے علماء کرام سے تو نہیں ملا کیونکہ ان میں سے ہر کوئی خود کو حق پر سمجھ کر دوسرے کو باطل پر قرار دیتا ہے۔ البتہ میری سوچ نے مجھے اتنی راہ ضرور دکھائی ہے کہ کسی عالم کو برا بھلا نہ کہوں اور نہ ہی مکمل طور پر اسے درست یا غلط سمجھوں بلکہ انھیں انسان سمجھوں جس سے لغزش کا قوی امکان ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ پرویز صاحب ایسے عالم ہیں کہ اپنی رائے کو حرفِ آخر سمجھ کر غور و فکر کا دروازہ کھلا رکھتے ہیں۔ کاش دوسرے عالم بھی اپنی رائے پر اصرار نہ کریں اور خود کو انسان ہی سمجھیں۔ اب تو میں اس مقولہ پر عمل کرتی ہوں کہ "یہ نہ دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے بلکہ یہ دیکھو کہ کیا کہہ رہا ہے؟"

لیکن اس الجھن کا خاتمہ یوں نہیں ہو سکتا جب تک سب علماء آپس میں دوستی اور محبت کے ساتھ مسائل کو طے نہ کریں۔ اس سلسلہ میں سب علمائے کرام سے چند گذارشات پر غور کرنے کی درخواست کرتی ہوں۔

---

[1] خدا نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے اور اختلافات کو خدا کا عذاب۔ (طلوعِ اسلام)

۱۔ علماء کی سوسائٹی مل جل ہونی چاہیئے یہ نہیں کہ ہر عالم اپنے اپنے مدح خوانوں کی محفل میں بیٹھ کر اپنے خیالات کو پختہ کرتے جائیں بلکہ انہیں مخالفین کی باتوں کو غیر جانبدار ہو کر سوچنا چاہیئے۔ اختلافی موضوعات پر بجائے برا بھلا کہنے کے خلوص سے غور کرنا چاہیئے اور ایک دوسرے کے خلاف جذبات رکھنے کی بُری عادت کو ختم کر کے بات کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

۲۔ ہر عالم کو یہ احساس ہونا چاہیئے کہ اگر وہ کسی بھی غلط نظریہ کو پیش کریں گے تو اُس کو قبول کرنے والے جتنے بھی لوگ ہوں گے اُن سب کا گناہ اُن پر ہو گا۔ تعجب ہے کہ اتنی بڑی ذمہ داری ہو اور علماء اپنے نقطۂ نظر پر اس قدر اصرار کریں؟۔

۳۔ اختلافات کو ذاتی اختلاف نہ بنایا جائے۔ اپنے نظریات کی تائید کروانے کی بجائے حق کی تلاش کو اپنا مقصودِ حیات قرار دیں۔

۴۔ جو بات کسی دوسرے کی غلط محسوس ہو اس کو اخبارات اور رسائل میں کیچڑ اچھالنے کی بجائے اُس شخص سے براہِ راست گفتگو کی جائے اور طنز و تنفر کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔ کسی کے خیالات کی غلط ترجمانی کرنا بہت بڑا جھوٹ ہے۔ اور اکثر علماء دوسروں پر تہمتیں لگاتے ہیں۔ حیرت ہے کہ عالم ہو کر اتنی بڑی غلطی؟۔

۵۔ اپنے ذہن کو حق کی قبولیت کے لئے بالکل کھلا رکھیں۔

۶۔ علماء ایک دوسرے کی تحریر و تقریر کا مطالعہ صاف دلی اور خلوص سے سمجھنے کی خاطر کریں۔ خامیاں تلاش کرنے کی خاطر نہ کریں۔ خود کو اپنے اپنے حامیوں کی محفل میں مقید نہ کریں۔

میری تمام علماء کرام سے نہایت ہی پُرخلوص اور دردمندانہ التجا ہے کہ وہ ان پر ضرور غور کریں آپس کے جھگڑوں کو ختم کریں، بھائی چارہ قائم کریں، فرقوں کو ختم کریں، دیانت داری سے ہر مسئلہ پر غور کریں اور مسلمانوں کو تقسیم ہونے سے بچائیں۔ اور سب سے بڑی یہ بات کہ مخلص مسلمانوں کو حق کی تلاش میں مدد دیں نہ کہ اپنے جھگڑوں کے باعث دین میں الجھنیں پیدا کریں۔ اگر علماء میری اس گذارش پر غور کریں تو ان کی بہت شکرگذار ہوں گی۔

"بنتِ اسلام"

کراچی کے دوستو! آیئے ہر اتوار کی صبح کو ۹ بجے سندھ اسمبلی ہال (بندر روڈ) میں مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب کے افکار میں سنیئے کہ قرآن عصرِ حاضر کے ہر چیلنج کا علیٰ وجہ البصیرت کیا جواب دیتا ہے۔ اور مسائلِ زندگی کا کس قدر نکھرا ہوا حل پیش کرتا ہے۔

دین میں غلو

نبی اکرمؐ نے حجۃ الوداع میں جو عدیم النظیر خطبہ ارشاد فرمایا وہ درحقیقت عالمگیر انسانیت کے لئے منشورِ حیات ہے۔ اس میں، چند فقروں میں، اسلام کے بنیادی اصولوں کو اس حسن و خوبی سے سمٹا دیا گیا ہے، کہ جوں جوں نگہِ بصیرت اس پر غور و تدبر کرتی ہے، حقائق کی ایک دنیا اس کے سامنے بے نقاب ہوتی چلی جاتی ہے اس خطبہ میں ایک بلیغ فقرہ یہ بھی ہے۔

ایاکم والغلو فی الدین۔ فانما اھلک قبلکم الغلو فی الدین

دین میں غلو مت کرو۔ تم سے پہلی قومیں اسی سے برباد ہوئی ہیں

آپ غور کیجئے کہ کیسی وسیع اور عظیم حقیقت ہے جسے چند الفاظ میں بیان فرما دیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت قرآن کریم کی اس آیت کی ترجمانی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ (۴/۱۷۱)۔ "اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں غلو مت کرو"۔ غلو کے معنی ہیں حد سے بڑھ جانا۔ دین میں حد سے بڑھنے کی کئی راہیں ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ خطرناک راہ وہ ہے جس میں شخصیتوں کو ان کے مقام سے آگے بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ چیز خود اس مقام سے واضح ہے جہاں یہ آیت آئی ہے۔ اس میں عیسائیوں سے کہا گیا ہے کہ تم حضرت عیسیٰ کو ان کے مقام سے مت بڑھاؤ۔ وہ خدا کے رسول ہیں۔ انھیں خدا کا رسول ہی سمجھو۔ خدا یا ابن اللہ قرار نہ دو۔ یہ غلو فی الدین ہے۔

آپ مختلف مذاہبِ عالم پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ کوئی قوم اپنے بانیٔ مذہب یا دیگر بزرگوں کی تنقیص نہیں کرتی۔ ان کے بارے میں غلو کرتی ہے۔ انھیں ان کے مقام سے گھٹاتی نہیں، آگے لے جاتی

ہے۔ ان کی مذمت نہیں کرتی۔ ان کی تعریف میں حد سے بڑھ جاتی ہے۔ ان سے نفرت یا عداوت نہیں برتتی ان کی محبت اور عقیدت میں مبالغہ کرتی ہے۔ اور یہی چیز ہے جو نبی اکرمؐ کے ارشادِ گرامی کے مطابق ان کی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ قرآن کریم نے، اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے جرائم کی فہرست میں (جن کی وجہ سے وہ تباہ ہوئے تھے) اس جرم کو نمایاں حیثیت دی ہے کہ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (۹/۳۱)۔ انھوں نے اپنے مذہبی پیشواؤں اور پیرانِ طریقت کو خدا سے ورے ہی اپنا رب بنا لیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ اس آیت کے نزول پر حضورؐ سے عرض کیا گیا کہ "یا رسول اللہ! یہ لوگ اپنے احبار و رہبان کی عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ جو اللہ نے حلال کیا ہے، اسے وہ حرام کہہ دیتے تو لوگ بھی اسے حرام سمجھ لیتے۔ اور جو اللہ نے حرام کیا ہے اسے حلال کہہ دیتے تو لوگ بھی اسے حلال سمجھ لیتے" اسی کا نام مذہبی پیشواؤں کو ان کے مقام سے آگے بڑھا کر خدا بنا لینا ہے۔ حلال و حرام کے تعین کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔ یہ اختیار کسی انسان کو دے دینا، اسے خدائی اختیارات کا حامل قرار دے دینا ہے۔ یہ غلو فی الدین ہے اور قوموں کی ہلاکت کا باعث۔ اسی کو قرآن کریم نے دوسری جگہ "اَنْدَادًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" سے تعبیر کیا ہے۔ جہاں فرمایا کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا۔ "وہ لوگ بھی ہیں جو خدا کے علاوہ اور ہستیوں کو بھی خدائی اختیارات اور اقتدارات کی مالک قرار دیتے ہیں"۔ اس کی تشریح اگلے الفاظ سے یہ کہہ کر کر دی کہ يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ۔ "وہ ان کی محبت اسی طرح کرتے ہیں جس طرح اللہ سے محبت کرنی چاہیئے۔ وہ اس محبت کا مظاہرہ ان کے ارشادات کی اطاعت سے کرتے ہیں یعنی وہ ان کے احکام کی اطاعت اسی طرح کرتے ہیں جس طرح خدا کے احکام کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ (۲/۱۶۵) لیکن ایمان والوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ صرف احکامِ خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں اور شدت و مدت سے اطاعت کرتے ہیں۔

یہ ہے دین میں غلو جس سے قومیں تباہ ہوتی ہیں۔ آیت (یا اهل الکتاب لا تغلوا فی دینکم ..... الخ) کی تفسیر میں، تفسیر ابن کثیر میں لکھا ہے کہ

> اہل کتاب کو زیادتی سے اور حد سے آگے بڑھ جانے سے اللہ تعالیٰ روک رہا ہے عیسائی حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں حد سے گذر گئے تھے اور نبوت سے بڑھا کر خدائی تک پہنچا رہے تھے۔ بجائے اطاعت کے عبادت کرنے لگے تھے۔ بلکہ اور بزرگانِ دین کی نسبت بھی ان کا عقیدہ خراب ہو چکا تھا۔ وہ انھیں بھی جو عیسائی دین کے عالم اور عامل تھے معصوم

جانتے لگ گئے تھے اور یہ خیال کر لیا تھا کہ جو کچھ یہ ائمۂ دین کہدیں اس کا ماننا ہمارے ذمے ضروری ہے۔ سچ اور جھوٹ۔ حق و باطل۔ ہدایت و ضلالت کے پرکھنے کا کوئی حق ہمیں حاصل نہیں جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہے۔ اتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ ۔۔۔۔۔ الخ

مسند احمد میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا مجھے تم ایسا نہ بڑھانا جیسا کہ نصاریٰ نے عیسیٰؑ ابن مریم کو بڑھایا۔ میں تو صرف ایک بندہ ہوں پس تم مجھے عبد اللہ اور رسول اللہ کہنا۔ یہ حدیث بخاری وغیرہ میں بھی ہے۔ مسند کی اور حدیث میں ہے کہ کسی شخص نے آپ سے کہا "اے محمدؐ! اے ہمارے سردار اور سردار کے لڑکے۔ اے ہم سب سے بہتر اور بہتر کے لڑکے!" تو آپ نے فرمایا۔ لوگو! اپنی بات کا خود خیال کر لیا کرو۔ تمہیں شیطان ادھر ادھر نہ کر دے۔ میں محمدؐ بن عبد اللہ ہوں۔ میں خدا کا غلام اور اس کا رسول ہوں قسم خدا کی میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے میرے مرتبے سے بڑھاؤ۔

حضورؐ کو اس کی اہمیت کا کس قدر شدید احساس تھا اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ آپ نے اپنی وفات سے قبل جن امور کی تاکید فرمائی' ان میں یہ بھی تھا کہ

حرام و حلال کی نسبت میری طرف نہ کی جائے۔ میں نے وہی چیز حلال کی ہے جو خدا نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے۔ اور وہی چیز حرام کی ہے جو خدا نے حرام کی ہے۔

اور یہ بھی کہ

یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو۔ انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو پرستش گاہ بنا لیا۔

ان ارشاداتِ نبویؐ کا مقصود یہ ہے کہ خدا کو خدا کے مقام پر رکھو۔ رسول کو رسول کے مقام پر۔ اور بزرگوں کو ان کے اپنے مقام پر۔

جب قومیں اپنے بزرگوں کو ان کے مقام سے بڑھا دیتی ہیں، تو جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ عیسائیوں کا مسلمانوں کے ساتھ جھگڑا کیا ہے؟ فقط یہ کہ مسلمان چاہتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کو ان کے صحیح مقام (عبد اللہ و رسول اللہ) پر رکھا جائے لیکن عیسائی اسے حضرت عیسیٰؑ کی تنقیص اور توہین سمجھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب کوئی قوم اپنے کسی بزرگ کو اس کے مقام سے آگے بڑھا دیتی ہے تو جو شخص اسے اس کے صحیح مقام پر لانے کی کوشش کرتا ہے' اس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس بزرگ کی توہین کر رہا ہے؟

اس سے مذہبی پیشوا عوام کو یہ کہہ کر بھڑکا دیتے ہیں کہ یہ شخص تمہارے بزرگوں کی ہتک کر رہا ہے، حالانکہ وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ان بزرگوں کو ان کے صحیح مقام پر لاتا ہے۔ قوموں کی یہی نفسیات ہے جس سے وہ تباہ ہوتی ہیں۔ یعنی جب کوئی قوم اپنے مذہب کے بانی یا دیگر بزرگوں کے صحیح مقام کے متعلق سمجھنے لگے کہ وہ ان کی توہین کے مراد ف ہے، وہ ضلالت کے جہنم میں گر کر تباہ ہو جاتی ہے۔

لیکن کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ ہم غیر مسلموں کے ساتھ تو آئے دن جھگڑتے رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بزرگان مذہب کو ان کے صحیح مقام سے آگے بڑھا رکھا ہے، لیکن کبھی نہیں سوچتے کہ کیا ہم نے بھی اپنے بزرگوں کے ساتھ یہی کچھ نہیں کر رکھا؟ ہم جب انہیں کہتے ہیں کہ وہ اپنے انبیاءؑ اور بزرگان کو ان کے صحیح مقام پر رکھیں تو اسے حق کی تلقین اور دین کی خدمت قرار دیتے ہیں (اور یہ بات ہے بھی ٹھیک) لیکن جب یہی بات کوئی ہم سے کہتا ہے تو اسے حق کا بدترین مخالف اور دین کا شدید ترین دشمن قرار دے کر اس سے سر پھٹول شروع کر دیتے ہیں! جب غیر مسلم اپنے بزرگوں کی بے جا عزت و تکریم کے جواز میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہمیں ان سے شدید محبت ہے اس لئے ہم اس باب میں کچھ نہیں سننا چاہتے۔ تو آپ اسے مذہبی دیوانگی (FANATICISM) قرار دیتے ہیں۔ لیکن جب کوئی آپ سے کہتا ہے کہ آپ اپنے فلاں بزرگ کی شان میں اس قدر غلو کیوں کرتے ہیں تو آپ یہ کہکر اسے خاموش کر دیتے ہیں کہ

مجھے معذور رکھ! میں مستِ صہبائے محبت ہوں

یہ "مستی صہبائے محبت" ہی تو ہے جسے قرآن کریم نے غلو فی الدین سے تعبیر کیا ہے اور جسے نبی اکرمؐ نے اقوام کی تباہی کا باعث بتایا ہے۔ یاد رکھئے! کوئی قوم نفرت اور عداوت کی بنا پر اپنے بزرگوں کی شان میں مبالغہ نہیں کرتی۔ وہ ایسا محبت اور عقیدت کی بنا پر ہی کرتی ہے۔ سو اگر ان کا اس بنا پر ایسا کرنا غلط ہے تو اسی بنا پر ہمارا ایسا کرنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ وہ لوگ تو پھر بھی ایک حد تک قابلِ معافی ہیں کہ ان کے پاس کسی کے صحیح مقام کے تعین کے لئے خدا کی طرف سے کوئی معیار نہیں، لیکن ہمارا جرم اس باب میں بڑا سنگین ہے۔ اس لئے کہ ہمارے پاس خدا کی وہ زندہ کتاب موجود ہے جو کائنات میں ہر شے کا صحیح صحیح مقام متعین کرتی ہے۔ قرآنِ کریم کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ وہ ہر شے کو اس کے حقیقی مقام پر رکھتی ہے۔ کسی شے کو اس کے اصلی مقام سے ہٹا دینے کو (امام راغب کے قول کے مطابق) ظلم کہتے ہیں۔ قرآن نے شرک کو ظلم عظیم کہا ہی اس لئے ہے کہ اس میں غیر خدائی ہستیوں کو ان کے مقام سے ہٹا کر آگے بڑھا دیا جاتا ہے۔ (اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ۳۱/۱۳)۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ان کے صحیح مقام سے ہٹا کر بہت آگے بڑھا رکھا ہے۔ جب کوئی شخص دوسرے

لوگوں کے ان معبودوں کے متعلق کہتا ہے کہ انہیں ان کے صحیح مقام پر رکھنا چاہیئے، آپ خوش ہوتے ہیں اور اسے دین کا سچا خادم قرار دیتے ہیں لیکن جوں ہی آپ کے "معبود" کی باری آتی ہے، آپ بھی پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

نبی اکرمؐ کے ارشادِ گرامی کو ایک مرتبہ پھر سامنے لایئے کہ

ایاکم والغلو فی الدین۔ فانما اھلك قبلکم الغلو فی الدین

دین میں غلو مت کرو۔ تم سے پہلی قومیں اسی سے برباد ہوئی ہیں

جس طرح پہلی قومیں، دین میں غلو کرنے سے تباہ ہوئی تھیں، ہماری تباہی کا بھی ایک بنیادی سبب یہی ہے۔ اگر ہم اپنے اس غلو کو اپنی محبت، عقیدت، ارادت، اور بزرگوں کی علو مرتبت اور رفعت عظمت' سے تعبیر کر کے اپنے آپ کو مطمئن کر لیں کہ یہ غلو نہیں، تو اس سے ہم اس کے نتائج سے نہیں بچ سکتے۔ ماں اپنے بچے کو کتنی ہی محبت سے، دوائی کی جگہ (غلطی سے) سنکھیا دیدے، سنکھیا اپنا ہلاک اثر کرکے رہے گا۔ ہم اس تباہی سے بچ نہیں سکتے جب تک ہم ہر واجب الاحترام ہستی کو اس مقام پر نہ رکھیں جو مقام اس کے لئے خدا کی کتاب نے تجویز کیا ہے۔ اگر ایسا کرنے میں ہمارا کوئی محبوب بزرگ اس مقام سے نیچے آجاتا ہے جو ہماری عقیدت مندی نے اسے عطا کر رکھا ہے، تو اسے اس بزرگ کی توہین نہ سمجھئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسا کرنا ہم پر بڑا گراں گذرتا ہے، اس لئے کہ عقیدت کا تعلق جذبات سے ہوتا ہے، اور جذبات کا بدلنا، بڑی ہمت چاہتا ہے۔ لیکن قرآن پر ایمان کے تو معنی یہ ہیں کہ جب ہمارے کسی جذبہ اور قرآن کی تعلیم میں کشمکش ہو (اس میں TIE پڑ جائے) تو ہم اپنے جذبہ کو قرآنی تعلیم کے تابع لے آئیں۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو قرآن پر ہمارے ایمان کے کچھ معنی نہیں۔ ایسا کرنے سے، نہ صرف یہ کہ آپ دین کے صحیح راستے پر چلیں گے، بلکہ آپ کے وہ بزرگ بھی آپ سے خوش ہوں گے۔ اس لئے کہ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر اس امر کی تصریح کی ہے کہ جن بزرگوں کو تم نے ان کے مقام سے آگے بڑھا رکھا ہے، وہ قیامت میں تمہارے دشمن ہوں گے اور تمہاری اس بے جا عقیدت مندی سے اظہار برأت کریں گے۔

آپ سوچئے کہ اس قسم کی عقیدت و ارادت جو خدا کے حکم کے خلاف۔ رسول اکرمؐ کے ارشادِ گرامی کے خلاف، اور خود ان بزرگوں کی طرف سے ہمارے لئے عداوت اور بیزاری کا موجب ہو، ہمارے لئے موجب تباہی نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن

ہماری نظر پیدا بڑی مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینے میں بنالیتی ہے تصویریں

لمحۂ فکریہ

دہلی سے ایک ماہنامہ شائع ہوتا ہے برہان۔ اس کے مدیر مولانا سعید احمد اکبر آبادی ہیں پرانے جینٹلمین پہلے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل تھے۔ اب علی گڑھ یونیورسٹی میں (غالباً) صدر شعبۂ دینیات ہیں۔ انھوں نے اپنے رسالہ کی مئی ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں ایک افتتاحیہ سپردِ قلم فرمایا ہے جو اہلِ پاکستان کے لئے غور و فکر کا کافی سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ بغرضِ سہولت ہم اسے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس کا پہلا حصہ حسبِ ذیل ہے:

> قرآن مجید اور اسوۂ نبویؐ کی تعلیمات کے پیشِ نظر مسلمانوں کو سب سے زیادہ حقیقت پسند اور واقعیت آگاہ ہونا چاہیئے تھا۔ بہ قولِ اقبالؔ کے یہی وہ وصف ہے جس کے بغیر کسی قوم کا زجاج حریفِ سنگ نہیں بن سکتا۔ لیکن یہ دیکھکر بہت افسوس اور دکھ ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں بہ حیثیت مجموعی یہ صفت اب مفقود ہوتی جارہی ہے اور انھوں نے اپنے مسائل و معاملات پر حقیقت پسندی (REALISM) کے بجائے جذباتیت (SENTIMENTALISM) کے ساتھ غور کرنے کی خو پیدا کر لی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ کسی گتھی کی ایک گرہ کھولنا چاہتے ہیں تو دس گرہیں اور لگ جاتی ہیں۔ اس کی تازہ اور دلچسپ مثال یہ ہے کہ الجزائر پر آزادی اور خود مختاری کی پو پھٹتی نظر آئی تو مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ نے الجزائری مسلمانوں کو "مجاہدین فی سبیل اللہ" کہا۔ غازی اور شہید کا لقب دیا اور ان سے توقعات قائم کر لیں کہ اب یہ لوگ آزاد

ہوتے ہی اسلامی حکومت قائم کریں گے اور اس کے نتیجے میں یہ ہوگا اور وہ ہوگا لیکن پچھلے دنوں الجزائری حکومت کے ایک نمائندہ نے نئی دہلی میں یہ اعلان کیا کہ الجزائر میں سیکولر جمہوری حکومت "قائم" کی جائے گی تو یہ سنتے ہی ان سب حضرات پر اوس سی پڑ گئی ہے اور انہیں ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ گویا الجزائر کے فداکارانِ حریت نے آزادی کی خلعتِ فاخرہ زیب تن کرتے ہی اپنا رخ بجائے کعبہ کے دیر و کلیسا کی طرف کر لیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سوچنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ زمانہ ملکوں کے آزاد اور خود مختار ہونے کا ہے اور ایشیا اور افریقہ میں جو ملک صدیوں سے غلام چلے آ رہے تھے اپنی اپنی جد و جہد آزادی کے طفیل میں یکے بعد دیگرے آزاد ہوتے جا رہے ہیں۔ ان سب ملکوں کی حالت یکساں نہیں ہے۔ بلکہ کہیں مسلمان اکثریت میں ہیں اور کہیں غیر مسلم۔ پھر جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں سب ہی ایک عقیدہ اور ایک خیال کے نہیں ہیں۔ ان میں سنی بھی ہیں اور شیعہ بھی۔ آزاد خیال بھی اور قدامت پرست بھی۔ پختہ کار و صادق بھی ہیں اور صرف نام کے مسلمان بھی! ان اختلافات سے قطع نظر مشاہدہ تو یہ ہے کہ ایک ہی مسلک و مشرب (مثلاً حنفی) کے علماء چند جدید مسائل پر بھی متفق نہیں ہو سکتے۔ اب اگر کسی ملک میں مسلمان اکثریت میں ہوں اور انہوں نے "اسلامی حکومت" بنا بھی لی تو آخر اس کی شکل و صورت کیا ہوگی؟ وہ سنی ہوگی یا شیعہ؟ اس کے قوانین کی بنیاد قرآن مجید کی کس تفسیر اور حدیث کی کس شرح پر رکھی جائیگی اور آخر میں فیصلہ کیونکر ہوگا؟ عددی اکثریت سے؟ تو سنی یا شیعہ (مثلاً) جو فرقہ بھی اقلیت میں رہ جائے گا وہ محسوس کرے گا کہ اس پر ظلم ہو رہا ہے۔ اور اگر ہر فرقہ کو یہ آزادی ہوئی کہ وہ اپنے اپنے مسلک فقہ کے مطابق عمل کرے تو انفرادی زندگی میں تو یہ چیز بھی جائے گی۔ لیکن اجتماعی مسائل میں اس آزادی سے کیا افراتفری اور بدنظمی نہیں پیدا ہو گی؟ پھر وہ اسلامی حکومت ہی کیا ہوئی جو نکاح متعہ اور سودی کاروبار جیسی چیزوں کو بند نہ کر سکے۔ صرف اس لئے کہ مسلمانوں کے بعض فرقے اس کے جواز کے قائل ہیں۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ یہ وہ اہم اور بنیادی نکتہ ہے جس کی طرف ہم پاکستان کے ارباب علم و بصیرت کی توجہ بار بار مبذول کراتے چلے آ رہے ہیں۔ پاکستان کے جدید آئین میں یہ شق رکھ دی گئی ہے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں

ہوگا جو اسلام کے خلاف ہو۔ بجا اور درست۔ پاکستان حاصل ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی طرزِ زندگی ہو۔ اسلامی معاشرہ ہو۔ اسلامی قوانین ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ جو قوانین یہاں نافذ ہوں گے وہ کونسے "اسلام" کے مطابق ہوں گے ——— شیعہ حضرات کے اسلام کے مطابق یا سنی حضرات کے؟ پھر سنیوں میں سے اہلِ حدیث حضرات کے اسلام کے مطابق یا اہلِ فقہ کے۔ .. ..

.. .. پھر اہلِ فقہ میں سے دیوبندی حضرات کے اسلام کے مطابق یا بریلوی حضرات کے؟ ان تمام فرقوں کا "اسلام" کا تصور الگ الگ ہے، اور جو قانون ایک فرقہ کے نزدیک اسلامی ہے، وہ دوسرے کے نزدیک غیر اسلامی ہے۔ برہان نے تو اس سوال کو یہ ثابت کرنے کے لئے چھیڑا ہے کہ اب دنیا میں "اسلامی حکومت" قائم ہی نہیں ہو سکتی (جیسا کہ اس نے اپنے مقالہ کے دوسرے حصے میں بصراحت لکھ دیا ہے) اس لئے تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں صحیح مسلک ہندوستان کے نیشنلسٹ مسلمانوں ہی کا تھا اور اب بھی ان کے نزدیک صحیح مسلک یہی ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کو پھر سے متحد کر دیا جائے اور اس میں سب سیکولر انداز کی حکومت کے تابع رہیں، لیکن ہمارے لئے یہ سوال اس حیثیت سے اہمیت رکھتا ہے کہ پاکستان میں ایسے اسلامی قوانین کس طرح مرتب ہوں گے جن کا اطلاق تمام فرقوں کے مسلمانوں پر یکساں ہو سکے گا؟ اس ضمن میں جو کچھ ہمارے "علمائے کرام" کے پیشِ نظر ہے، اس کی روشنی میں، برہان کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ایسے قوانین مرتب ہو نہیں سکتے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ پرسنل لاء ہر ایک فرقہ کے اپنے اپنے ہوں، اور ملک کے عام قوانین سیکولر رہیں۔ اور اس پر برہان کا 'چھپا ہوا طعن' بھی بالکل بجا ہے کہ اگر پاکستان میں بالآخر یہی کچھ ہونا تھا تو پھر اس حصے کو ہندوستان سے الگ کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ یہ کچھ تو مسلمانوں کو وہاں بھی میسر ہو سکتا تھا۔

لیکن جو کچھ طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے، اس کی روشنی میں صورتِ حالات بالکل بدل جاتی ہے۔ طلوعِ اسلام کی دعوت یہ ہے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے اختلافات کے باوجود ان میں ایک ——— اور صرف ایک ——— چیز ایسی ہے جس پر تمام فرقوں کا اتفاق ہے۔ اور وہ ہے قرآن کریم۔ لہٰذا اصول یہ قائم کیا جائے کہ ملک میں کوئی قانون ایسا نافذ نہیں ہوگا جو قرآن کریم کے خلاف ہو۔ یہ وہ قوانین ہوں گے جن کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے گا۔ اور یہی پاکستان کی جداگانہ تشکیل کا مقصد تھا۔

ہمیں بصد افسوس ہے کہ ہمارے قدامت پرست طبقہ نے حقیقت پسندی سے کام لینے کے بجائے اس اہم سوال کو جذبات کے سیلاب میں بہا دیا اور اس کے خلاف یہ کہہ کر طوفان برپا کر دیا کہ یہ سنتِ رسول اللہ

کا انکار ہے۔ اس لئے کفر ہے۔ ہم انہیں کس طرح اپنا سینہ چیر کر دکھائیں کہ ہمارے دل میں حضور رسالتمآب کی عقیدت، محبت اور ارادت، اگر زیادہ نہیں تو ان حضرات سے کسی صورت میں بھی کم نہیں ـــــ اُس سے زیادہ سوختہ بخت اور کون ہو سکتا ہے جس کے دل میں حضورؐ کی محبت اور عظمت نہ ہو۔ لیکن اس وقت ملک کے سامنے جو اہم سوال پیش ہے، وہ عملی حل کا متقاضی ہے۔ اور وہ عملی حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ قانون کی بنیاد اس چیز پر رکھی جائے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ فقہ ہر فرقہ کی الگ ہے۔ سنت رسول اللہ، ہر فرقہ کی الگ الگ ہے لیکن قرآن کریم تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کے لئے متفق علیہ اسلامی قانون کی بنیاد، قرآن کے علاوہ کوئی اور ہو نہیں سکتی۔ بدقسمتی سے قرآن کریم کے متعلق بھی یہ کہا جاتا ہے کہ ہر فرقہ کی قرآن کی تفسیر الگ الگ ہے۔ اس لئے قرآن سے بھی ایک متفق علیہ ضابطہ قوانین کیسے مرتب ہو سکے گا؟ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے جو قرآن کے متعلق پیدا کیا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہر فرقہ کی قرآن کی تفسیر الگ ہے لیکن یہ اس لئے ہے کہ ہر فرقہ، قرآن کریم کو اپنے مسلک اور مشرب کے تابع رکھتا ہے۔ وہ بنیاد اور حجت (آخری دلیل) خارج از قرآن چیزوں کو قرار دیتا ہے، اور پھر اُن کے مطابق قرآن کی تفسیر کرتا ہے۔ اگر قرآن کو بنیاد اور حجت تسلیم کر لیا جائے تو یہ ممکن نہیں کہ قرآنی احکام کی ایسی تعبیریں ہو سکیں جو ایک دوسرے سے متضاد ہوں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن کو خارجی اثرات سے منزہ کر دینے کے بعد بھی، اس کے احکام میں تضاد اور اختلاف رہتا ہے، تو یہ چیز قرآن کریم کے اپنے دعوے کے خلاف ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میرے منجانب اللہ ہونے کی دلیل۔ یہ ہے کہ اس میں ۔۔ ۔۔ ۔۔ کوئی اختلافی بات نہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ قرآن میں بھی اس کی صلاحیت نہیں کہ وہ ہمیں متفق علیہ راہ نمائی دے سکے، تو وہ اسلام کی طرف سے قطعی طور پر مایوس ہے۔ اُسے یہ راستہ چھوڑ دینا چاہیئے۔ (سیکولرسٹ مسلمان اسی مایوسی کا شکار تھے اور ہیں) لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارا قدامت پرست طبقہ جس نقطۂ نگاہ کو پیش کرتا ہے اس کا عملی نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں سامنے آتا کہ ایک ایسے ضابطہ قوانین کا مرتب کرنا ناممکن ہے جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو اسلامی حکومت کے قیام کو ناممکن بنا دیتی ہے۔ مسلمانوں کے ممالک میں جو اسلامی حکومتیں قائم نہیں ہو رہیں اس کی وجہ ہمارے علمائے کرام کا یہی مسلک ہے۔ خود پاکستان میں اب یہ سوال، نظری منازل سے آگے بڑھ کر عملی منزل میں پہنچ چکا ہے۔ اب یہ حقیقت عنقریب سامنے آ جائے گی کہ کیا ہمارے علماء کرام کے پیش ہا دکے مطابق ایسے اسلامی قوانین مرتب ہو سکتے ہیں جن کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو؟ اچھا ہے کہ یہ تجربہ ہو جائے لیکن ہمیں خطرہ یہ ہے کہ

اگر یہ تجربہ ناکام رہا اور یہ یقیناً ناکام رہے گا، تو یہاں سیکولر انداز حکومت کے قیام کی تحریک پھر بیدار ہو جائے گی ——— اور اگر (خدا نکردہ) یہاں ایک دفعہ سیکولر انداز کی حکومت قائم ہو گئی تو پھر اسلامی حکومت کا قیام ناممکن (نہیں تو) بے حد دشوار ہو جائے گا۔ یہی نہیں۔ بلکہ اس وقت خود پاکستان کے الگ وجود کے لئے بھی کوئی وجہ جواز نہیں رہے گی۔ یہ ہے وہ عملی اور واقعاتی صورت حالات جس کے پیش نظر طلوع اسلام، یہ دعوت پیش کرتا چلا آرہا ہے کہ قرآن کریم کو قانون کی بنیاد تسلیم کر لیا جائے اس کے سوا اس مشکل کا کوئی حل نہیں۔ علامہ اقبالؒ نے خوب کہا تھا کہ اسلامی مملکت کا تصور دیا تھا تو ان کے نزدیک بھی اس کے قیام کی عملی شکل یہی تھی۔ ان کے خطبات اس حقیقت کی زندہ شہادت ہیں۔

اور یہ بات بھی غور طلب ہے کہ جو قانون قرآن کریم کے مطابق ہوگا وہ کبھی صحیح سنت رسول اللہ کے خلاف ہو سکتا ہے؟

اب برہان کے افتتاحیہ کا دوسرا حصہ لیجئے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:۔

علاوہ ازیں سوال یہ ہے کہ، اچھا اگر اپنی اکثریت کے ملکوں میں مسلمانوں نے اپنی حکومت کو اسلامی قرار دے بھی دیا، اس سے قطع نظر کہ وہ درحقیقت اسلامی ہے یا محض برائے نام ہی، تو اب یہ ارشاد ہو کہ جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں کس قسم کی حکومت قائم کی جائے؟ عیسائی، یہودی، بودھ، ہندو، جینی، پارسی یا سیکولر؟ اگر پہلی صورت منظور ہے تو اپنے حوصلہ وظرف کے گریبان میں منہ ڈال کر بتلایئے کہ آپ اس غیرمسلم مذہبی حکومت کے بوجھ کو برداشت بھی کر سکیں گے؟ کیا آپ کو امید اور بھروسہ ہے کہ اس حکومت میں آپ کی اسلامی زندگی اور اس کے مفادات محفوظ رہیں گے؟ اور اگر اس کے برعکس دوسری صورت یعنی سیکولرزم آپ کو پسند ہو تو اب یہ فرمایئے کہ جن ملکوں میں آپ اقلیت میں ہیں وہاں کی اکثریتوں کا دل کبھی آپ کی طرف سے صاف ہو سکتا ہے؟ وہ کہیں گی نہیں کہ آپ (یعنی مسلمان) عجب خودغرض اور موقع پرست لوگ ہیں۔ جہاں کہیں اقلیت میں ہوتے ہیں وہاں مطالبہ کرتے ہیں کہ حکومت سیکولر جمہوریہ ہو جس میں کسی مذہب کے ساتھ ترجیحی سلوک نہ کیا جائے اور جہاں ہر شخص کو شہری حقوق یکساں حاصل ہوں لیکن جس

ملک میں آپ کی ذرا سی بھی اکثریت ہوتی ہے۔ وہاں آپ اس ملک کی غیر مسلم اقلیتوں کا ذرا خیال نہیں کرتے اور جھٹ اپنی حکومت کے "اسلامی" ہونے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ غور فرمایئے! مختلف ملکوں کی غیر مسلم اکثریتوں کے دل و دماغ میں اگر یہ خیال جم گیا تو دنیا کے تمام مسلمانوں کو بیک وقت سامنے رکھ کر ارشاد فرمایئے کہ مجموعی طور پر دو چار ملکوں کی حکومت کو اسلامی کہہ دینے سے مسلمانوں کو فائدہ زیادہ پہنچے گا یا نقصان؟ زید کے لئے ایک محفوظ قلعہ بنا کر خود اپنے گھر میں سکون سے نہ رہ سکنا کونسی شرط عقلمندی یا اسلام کی کس تعلیم کے مطابق ہے؟

اس سے قطع نظر، خود اسلام کے فلسفۂ اخلاق اور اس کی تعلیمات کی روشنی میں غور کیجئے۔ فقہ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ اگر مسلم تاجر دارالاسلام سے دارالحرب میں جائے اور وہاں کی حکومت اس کے ساتھ یہ مراعات کرے کہ چنگی کا محصول فی روپیہ میں دو آنہ معاف کر دے تو اس کے جواب میں دارالاسلام کی حکومت کا فرض ہے کہ دارالحرب کا کوئی تاجر ادھر آئے تو اس کو روپیہ میں چار آنہ چنگی کا محصول معاف کرے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ نحن احق بالمکارم والاخلاق۔ کیا ان احکام سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اگر غیر مسلم اکثریت کے ملکوں نے سیکولر جمہوریت قائم کی ہے جس کا فائدہ ان ملکوں کی مسلم اقلیت کو پہنچ رہا ہے اور اس حد تک کہ دستوری اعتبار سے ایک مسلمان بھی ان ملکوں کا صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم اور کمانڈر انچیف ہو سکتا ہے تو اب اس کے جواب میں مسلم اکثریت کے ملکوں کو بھی چاہیئے کہ وہ اپنے لئے ایک ایسی طرز حکومت اختیار کریں جس کے تحت ان ملکوں میں غیر مسلم اقلیتوں کو بھی وہی مراعات اور وہی حقوق حاصل ہوں جو مسلمان اقلیتوں کو غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں حاصل ہیں یعنی وہاں سیکولر جمہوریت ہو تو یہاں بھی وہی ہو۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ آجکل کا زمانہ پہلے زمانہ .... سے بالکل مختلف ہے۔ پہلے ایک قوم دوسری قوم کو فتح کرتی تھی اور اس پر من مانے طریقوں سے اچھے ہوں یا برے حکومت کرتی تھی۔ لیکن آج کوئی ایک مذہبی قوم کسی دوسری قوم کو تلوار کے ذریعہ فتح نہیں کر سکتی، یہ دور عوامی تحریکات اور عوامی سرگرمیوں کا ہے اور ان تحریکات

میں ملک کے سب عوام، مذہب، زبان، کلچر اور تہذیب کے اختلاف کے باوجود مل جل کر ملک کو آزاد کرانے کی جد وجہد کرتے ہیں اور تب ہی ملک آزاد ہوتے ہیں اور ہو رہے ہیں اور خود الجزائر میں بھی صورت حال یہی ہے۔ غیر مسلموں کا ایک بڑا طبقہ ہے جو وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ پورا تعاون کر رہا ہے پس اب اگر ان سب کی متفقہ مساعی اور اشتراک عمل سے الجزائر آزاد ہوتا ہے اور الجزائر کے مسلمان ان تمام باتوں کے پیش نظر جن کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں، الجزائر کے لئے سیکولر جمہوریہ گورنمنٹ پسند کرتے ہیں، تو اس میں برا ماننے کی یا ان پر طعن کرنے کی کونسی بات ہے؟ ایک سیکولر جمہوریہ میں اسلامی مفادات کے تحفظ اور قانون حق کے اعلاء کا سروسامان کیونکر ہو سکتا ہے، اس پر ہم آیندہ لکھیں گے۔

یہ حصہ وہ ہے جس میں ان حضرات (نیشنلسٹ مسلمانوں) کی، اسلام کے مستقبل کی طرف سے مایوسی بالکل ابھر کر سامنے آگئی ہے۔ یہی وہ مایوسی ہے جسے مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی آخری کتاب (آزادیٔ ہند) کے آخری باب میں کھلے کھلے الفاظ میں بیان کر دیا تھا۔[1]

سوال بالکل صاف اور سیدھا ہے۔ اگر اسلام نام ہے چند اعتقادات عبادات یا نکاح، طلاق وغیرہ سے متعلق پرسنل لاز کا، تو پھر ایک سیکولر حکومت میں واقعی اس کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔ پھر مسلمانوں کو جداگانہ اسلامی حکومت کے قیام کے "خیال خام" کو ترک کر دینا چاہیئے۔ لیکن اگر اسلام نام ہے، زندگی کے ہر شعبے میں، قوانین خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنے کا، تو پھر سیکولر حکومت میں اسلامی زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے جداگانہ اسلامی مملکت کی ضرورت لاینفک ہے جس میں قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر ہو۔ یہ تصور، نہ تو "محض کسی عہد کہن کی یادگار" ہے اور نہ ہی اس زمانے میں "ناممکن العمل"۔ یہ خدا کا متعین کردہ تصور (انداز) زندگی ہے جو ہر زمانے میں ممکن العمل ہی نہیں بلکہ نوع انسان کی آخری تقدیر (DESTINY) ہے۔ دنیا کو آخر الامر اسی انداز زندگی کی طرف آنا ہوگا۔ خود ہمارے زمانے کے تقاضے اس کی شہادت دے رہے ہیں ___ جو مسلمان کسی سیکولر حکومت کے ماتحت زندگی کے دن بسر کرنے پر مجبور ہوں (خواہ وہ حکومت مسلمانوں کی ہو یا غیر مسلموں کی) انہیں اس حقیقت کا ہر وقت احساس ہونا

[1] اس کتاب پر طلوع اسلام بابت جون ۱۹۵۹ء میں تفصیلی تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔

چاہیئے کہ ان کی یہ حالت اضطراری ہے۔

باقی رہا یہ کہ اسلامی حکومت قائم کرنے والے مسلمان' ان مسلمانوں کے متعلق کیا چاہیں گے۔ جو غیر مسلموں کی حکومت میں بسنے پر مجبور رہیں' تو اس کا جواب بالکل آسان اور واضح ہے۔ ہم ان غیر مسلم حکومتوں سے صرف اتنا کہیں گے کہ جو مراعات اور حقوق' اسلامی حکومت اپنے ہاں کے بسنے والے غیر مسلموں کو دیتی ہے آپ اپنے ہاں کے مسلمانوں کو وہی مراعات اور حقوق دیدیں۔ ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے۔ اس کے بعد آپ دیکھیئے گا کہ ان مسلمانوں کی حالت کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ اگر آج ہندوستان کی سیکولر حکومت اپنے ہاں کی اقلیتوں کو وہ حقوق و مراعات دیدے جو قرآنی حکومت میں غیر مسلموں کو حاصل ہوتے ہیں تو آپ دیکھئے کہ وہاں کے مسلمانوں کی وہ مصیبتیں کس طرح رفع ہو جاتی ہیں جن میں وہ اس وقت اس بُری طرح سے مبتلا ہیں۔

باقی رہا برہان کا یہ کہنا کہ "ایک سیکولر جمہوریہ میں اسلامی مفادات کے تحفظ اور قانونِ حق کے اعلاء کا سروسامان کس طرح سے ہو سکتا ہے" تو اس کے متعلق اسے کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی موجودہ حالت اس پر پوری طرح سے شاہد ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں پر جو کچھ گذر رہی ہے، (اور جس کے تصور سے ہمارا دل خون ہو جاتا ہے) اس کے پیشِ نظر توقع ہو سکتی تھی کہ وہاں کا نیشنلسٹ مسلمان اس حقیقت کو تسلیم کرلے گا کہ اس نے تحریک پاکستان کی مخالفت کر کے بڑی غلطی کی۔ اگر وہ اس کی مخالفت نہ کرتے تو آج پاکستان کا جغرافیہ کچھ اور ہوتا۔ اور ہندوستان کے تمام مسلمان ایک آزاد مملکت (پاکستان) میں' زندگی بسر کر رہے ہوتے لیکن بُرا ہو ضد کا کہ وہاں کا نیشنلسٹ مسلمان' ابھی تک' نہ صرف اپنے موقف کو حق بجانب ثابت کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے بلکہ اس مخالفت میں اس حد تک آگے بڑھ گیا ہے کہ وہ دنیا میں اسلامی حکومت کے قیام کے تصور ہی کو (معاذ اللہ) حماقت قرار دے رہا ہے! سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر اسلامی حکومت کے قیام کا تصور (پناہ بخدا) حماقت ہے' تو پھر قرآنِ کریم کی ان متعدد آیات و احکام کا مفہوم کیا لیا جائے گا جن میں اس نے ایمان و اعمال صالح کا فطری نتیجہ اس دنیا میں حکومت بتایا ہے۔ ($\frac{۲۴}{۵۵}$) جن میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ جب جماعت مومنین کی حکومت قائم ہو گی تو وہ اس قسم کے فرائض سرانجام دیں گے۔ ($\frac{۲۲}{۴۱}$)۔ کیا قرآن کے یہ تمام احکام اور اصول محض وقتی تھے اور اب ناقابلِ عمل ہونے کی وجہ سے منسوخ ہو چکے ہیں؟ پھر قرآن کریم کی راہ نمائی میں' نبی اکرمؐ اور جماعت صحابہؓ نے' عمر بھر کی تگ و تاز' اور بے مثال قربانیوں کے بعد جو حکومت قائم کی تھی' اس کے متعلق کیا رائے قائم کی جائیگی؟

کیا وہ محض ایک "اتفاقی حادثہ" تھا؟ یا (معاذ اللہ) ہوسِ ملک گیری کی تسکین؟

یہ ہے اسلام کے متعلق ان حضرات کا تصور! کس قدر صحیح فرمایا تھا حکیم الامت نے ان حضرات کی اس "قومیت پرستی" کے متعلق کہ

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

"ہمارے کلچر کے نشانات

موہن جو دارو اور ہڑپا کے کھنڈرات میں نہیں ملیں گے۔ ان کے نقوش

بدر و حنین کے میدانوں میں جگمگاتے نظر آئیں گے"۔

یہ تھے وہ الفاظ جن پر

پروفیسر شمیم انور نے

طلوعِ اسلام کنونشن میں اپنی تقریر کا خاتمہ کیا۔ جس کا عنوان تھا ——

"پاکستان اور اسلامی کلچر" یہ تقریر انگریزی زبان میں تھی جسے الگ پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا جا چکا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ آئندہ اشاعت میں پیش کیا جائے گا۔

نقد و نظر

اسلامک سٹڈیز سورۂ کہف میں ہے۔ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا۔ ان سے کہو کہ کیا ہم تمہیں بتائیں کہ وہ کون ہیں جن کے کام انہیں، فائدہ پہنچانے کے بجائے سب سے زیادہ گھاٹے میں رکھتے ہیں؟ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ دنیاوی زندگی کے کاروبار میں ان کی کوششیں بالکل رائیگاں جاتی ہیں اور وہ بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ ہم بہت بڑا کام کر رہے ہیں۔ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ۔ (۱۸/۱۰۳-۱۰۵) سو ان کے تمام اعمال بے نتیجہ رہ کر ضائع چلے جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے بتایا یہ ہے کہ سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے وہ نہیں ہوتے جو کچھ نہیں کرتے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو کرتے تو بہت کچھ ہیں لیکن چونکہ ان کے کام صحیح پروگرام کے مطابق نہیں ہوتے، اس لئے وہ بے نتیجہ رہ جاتے ہیں ——

اس کی زندہ مثال ہمارے سامنے ہے۔ ہمارے ہاں اسلامک ریسرچ کے نام پر جو کچھ خرچ ہو رہا ہے، اسے بہ حیثیت مجموعی دیکھا جائے، تو اس ملک کے اقتصادی حالات کے پیش نظر وہ کچھ کم نہیں۔ لیکن اس کا نتیجہ دیکھا جائے تو سوائے حبطت اعمالھم کے اور کچھ نہیں۔ ملک میں کتنے ادارے ہیں جن پر مملکت کی امداد کی شکل میں لاکھوں روپے سالانہ خرچ ہوتے ہیں، لیکن جب ان کی تحقیق کا ماحصل دیکھا جائے، تو سوائے اس کے کہ انسان سر پکڑ کر رہ جائے، کچھ اور کر نہیں سکتا۔ انہی اداروں میں ایک سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ (مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامیہ) کراچی ہے جو برسوں سے مصروف تحقیق ہے لیکن آج تک کسی پر یہ راز نہیں کھلا کہ وہ اسلام کے متعلق تحقیق کیا کر رہے ہیں، اور اس تحقیق نے کیا ماحصل کیا ہے۔ اسی ادارہ نے اب ایک سہ ماہی رسالہ (اسلامک سٹڈیز کے نام سے) جاری کیا ہے جس کا پہلا شمارہ (جو مارچ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا) زیر تبصرہ ہے۔ یہ (انگریزی زبان میں) ایک سو چالیس صفحات پر مشتمل مجلہ ہے جس کی قیمت (فی پرچہ) پانچ روپے

(اور سالانہ اٹھارہ روپے) ہے۔

ادارہ کے نام (اسلامک ریسرچ یا تحقیقاتِ اسلامیہ) سے آپ کا ذہن اس طرف منتقل ہوا ہو گا کہ اس مجلہ میں اسلام سے متعلق، پوری چھان بین (تحقیق) کے بعد مضامین شائع ہوں گے۔ یا جو مضمون بھی شائع ہو گا اس کے متعلق بتایا جائے گا کہ ادارہ کی تحقیق کی رو سے اس میں کونسی بات اسلام کے مطابق ہے اور کونسی خلاف۔ لیکن آپ کا یہ خیال غلط ہے۔ مجلہ کے افتتاحیہ میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ اس میں مختلف لوگوں کے مضامین شائع ہوں گے۔ اور

جو خیالات ان مضامین میں پیش کئے جائیں، مجلہ پر ان کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوگی۔

مجلہ یہ ذمہ داری اپنے سر کیوں نہیں لے گا! اس لئے کہ

یہ بات غیر اسلامی ہو گی کہ مجلہ جو کچھ شائع کرے اسے خود ہی تولنے بھی بیٹھ جائے اور اس طرح امت سے فیصلہ کرنے کا حق چھین لے۔

بالکل بجا فرمایا! کسی معاملہ کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اسلام کے مطابق ہے یا اس کے خلاف، واقعی "غیر اسلامی" طرزِ عمل ہے اور بارگاہِ خداوندی میں جرمِ عظیم!! اسلامی ریسرچ کرنے والوں کو اس سے بچنا چاہیئے۔

اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ

خدا نے ہر مسلمان کو اس کا حق دیا ہے کہ وہ آزادانہ تحقیق کرے اور کسی فیصلہ پر پہنچے۔

دوسروں کے خیالات سے رواداری برتنا، اسی حق کی دوسری سمت ہے۔

"آزادانہ تحقیق" کا حق مسلّم لیکن سوال یہ ہے کہ جس ادارہ نے "اسلامک ریسرچ" کا فریضہ اپنے ذمے لے رکھا ہے، اور اس کے لئے قوم کا لاکھوں روپیہ اس پر صرف ہو رہا ہے، کیا یہ اس کی ذمہ داری نہیں کہ وہ دوسروں کی تحقیق کو پیش کرنے کے بعد، یہ بتائے کہ خود اس ادارہ کی تحقیق کی رو سے، وہ اسلام کے مطابق ہے، یا مخالف۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا کوئی ایسا معیار ہے بھی یا نہیں جس سے یہ معلوم کیا جا سکے کہ جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے وہ اسلام کے مطابق ہے یا مخالف؟ کیا ہم اس ادارہ سے پوچھ سکتے ہیں کہ انہوں نے اتنے عرصہ سے اسلامک ریسرچ کا جو کام شروع کر رکھا ہے، اس کے لئے ان کے سامنے، اسلامی نقطۂ نگاہ سے، غلط اور صحیح کے پرکھنے کا معیار کیا ہے؟ یا وہ بغیر کسی سند اور معیار کے تحقیق کئے جا رہے ہیں؟

یہ تو رہا معیارِ تحقیق کا سوال۔ جہاں تک موضوعاتِ تحقیق کا تعلق ہے، اس بارے میں بھی ہمارے ہاں عجیب انداز پایا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کو یہ معلوم ہو جائے کہ بغداد میں ایک نعلبند تھا جس کے پاس لوگ دور

دور سے نعلبندی کے لئے آتے تھے، تو اس کے متعلق تحقیق بھی "اسلامک ریسرچ" کہلائے گی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ "اسلامک ریسرچ" میں مصروف اداروں کے کارناموں کو دیکھئے تو ان میں عجیب و غریب قسم کے عنوانات سامنے آئیں گے یعنی ان کے نزدیک ہر وہ بات جو کسی مسلمان نے کی ہے "اسلامی" ہے اور اس کے متعلق تحقیق "اسلامک ریسرچ" کا جزو۔ اس نقطۂ نگاہ سے اگر زیرِ نظر شمارہ کو دیکھا جائے تو اس میں اسلامی تحقیق سے متعلق صرف دو مقالے ہیں۔ ایک محترم فضل الرحمٰن صاحب کا مقالہ جس کا عنوان ہے۔

قرنِ اول میں سنت۔ اجتہاد اور اجماع کا تصور۔

اور دوسرا، محترم اسماعیل الفاروقی صاحب کا مقالہ جس کا موضوع ہے۔

قرآنی تعبیر کا نیا طریق کار۔

ایک مضمون میں بتایا گیا ہے، کہ مسلمانوں کے ممالک میں عائلی قوانین کی اصلاحات کے سلسلہ میں کیا کچھ کہا گیا ہے۔ (اس میں بھی اس کی وضاحت نہیں کی گئی کہ یہ اصلاحات کس حد تک اسلام کے مطابق ہیں اور کس حد تک اس کے خلاف)۔ اس کے علاوہ ابن رشد۔ عبد اللطیف بغدادی اور مولانا روم سے متعلق تین مضامین ہیں۔ اور ایک مضمون، سلطنت عثمانیہ کے زوال کے متعلق شاہدات پر مشتمل ہے۔

محترم فضل الرحمٰن صاحب کا مقالہ ناتمام ہے اور آئندہ اشاعت میں اس کی تکمیل کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس لئے اس وقت اس پر تبصرہ، قبل از وقت ہوگا۔ اس سلسلہ میں ہم موصوف سے یہ عرض کریں گے کہ وہ اس تحقیق کے ساتھ (کہ قرنِ اول میں سنت۔ اجتہاد اور اجماع کا کیا تصور تھا) اس امر کی بھی وضاحت فرمائیں کہ اگر آج کوئی مملکت طے کرے (جیسا کہ پاکستان نے آئینی طور پر طے کیا ہے) کہ اس کے قوانین اسلام کے خلاف نہیں ہوں گے، تو وہ اس کے لئے کیا طریق کار اختیار کرے، اور کسی قانون کے اسلامی یا خلافِ اسلام ہونے کے لئے کونسی کسوٹی استعمال کرے۔ یہ کرنے کا اصلی کام ہوگا۔

جہاں تک فاروقی صاحب کے مقالہ کا تعلق ہے، ہم اسے پڑھ کر انگشت بدنداں رہ گئے کہ قرآنی تعبیرات کے متعلق ان کا تجویز کردہ طریق کار اختیار کر لینے کے بعد، قرآن کس طرح (معاذ اللہ) بازیچۂ اطفال بن جائیگا! جو کچھ انھوں نے فرمایا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ۔

> قرآن کریم کے تمام احکام ایک سطح اور ایک ہی قدر و قیمت کے نہیں۔ بعض احکام بلند سطح اور قیمت کے ہیں، بعض اس سے پست سطح اور کم قیمت کے۔ بعض کا تعلق اصل و غایت سے ہے اور بعض کا محض ذرائع سے۔ ہماری سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم قرآن

کے تمام احکام کو ایک ہی سطح کے خیال کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان سب کی اطاعت ہم پر واجب ہے۔

ایسا خیال کرنا غیر اسلامی ہے۔ اس سے قرآن کے بعض احکام اس کے دیگر احکام سے متضاد نظر آتے ہیں، اسی کی وجہ سے قرآن پر عمل کرنا دشوار ہے۔ یہ اسی صورت میں قابلِ عمل قرار پا سکتا ہے کہ عند الضرورت، بلند سطح کے حکم کی خاطر اس سے نچلی سطح کے حکم کو ترک کر دیا جائے۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اس دور میں اجب ہمارے سامنے مسائل یہ ہیں کہ قرآن کو آئینی شکل کس طرح دی جائے اور اس کے پیغام کو آئیڈیالوجی میں کس طرح سمویا جائے۔

تمام مسلمانوں کے کرنے کا کام یہ ہے کہ قرآن کے احکام کو ان کی قیمت اور سطح کے لحاظ سے از سرِ نو مرتب کیا جائے۔ (صفحہ ۴۲)

اور اس طرح مرتب کردہ فہرست پر اس طرح عمل کیا جائے کہ بلند سطح کے احکام پر عمل کرنے کے لئے نچلی سطح کے احکام کو ترک کر دیا جائے۔ یعنی قرآنی احکام و قوانین کی قدر و قیمت ہم خود متعین کریں جس حکم کے متعلق سمجھیں کہ اس کی قیمت زیادہ ہے اسے اوپر رکھیں، جس کے متعلق ہمارا فیصلہ ہو کہ وہ نسبتاً کم قیمت کا ہے اسے نیچے رکھیں۔ اور اس طرح اس خود مرتب کردہ فہرست کے مطابق قرآن پر یوں عمل کریں کہ بلند سطح کے احکام کی تعمیل کے لئے ادنیٰ سطح کے احکام کو ترک کر دیا جائے۔

یہ ہے وہ تجویز جو قرآن پر عمل کرنے کے سلسلہ میں، اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے پیش ہو رہی ہے (واضح رہے کہ فاروقی صاحب کا اسمِ گرامی اس مجلہ کے ادارہ تحریر کے ارکان میں شامل ہے یعنی وہ باہر کے آدمی نہیں، خود اس انسٹی ٹیوٹ سے متعلق ہیں) اس تجویز کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے احکام، قوانین اور اصول یونہی بکھیر دیئے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اپنی صوابدید کے مطابق، انہیں ایک خاص ترتیب عطا کریں، اور جن احکام کے متعلق ہم فیصلہ کریں کہ وہ پست قیمت کے ہیں، انہیں چھوڑ دیں، اور بلند سطح کے احکام پر عمل کریں۔ ان کا ارشاد ہے کہ ایسی فہرست مرتب کرنا خدا اور رسول کے منشا کے عین مطابق ہے اور ایسا نہ کرنا غیر اسلامی ہے۔

ہم محترم مقالہ نگار اور ان کی وساطت سے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی خدمت میں گذارش کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن کریم کا ہر حکم اپنے اپنے مقام پر یکساں قدر و قیمت رکھتا ہے اور جب وہ حالات پیدا ہو جائیں

جن کے لئے وہ حکم دیا گیا ہے، ان میں، اس پر عمل کرنا اسی طرح واجب ہو جاتا ہے جس طرح (فاروقی صاحب کے اصول کے مطابق کسی) بڑے سے بڑے حکم پر عمل کرنا۔ (مثلاً) قرآن کریم نے جب کہا ہے کہ وضو میں کہنیوں تک ہاتھ دھو۔ تو یہ حکم اپنی جگہ پر محکم اور اٹل ہے۔ یہ کسی دوسرے حکم سے کم قیمت، یا پست سطح کا نہیں۔ قرآن کریم کے بعض احکام غیر مشروط ہیں اور بعض حالات و شرائط سے مشروط۔ مثلاً اس کا یہ حکم کہ دشمن سے بھی عدل کرو، غیر مشروط حکم ہے۔ یہ کسی وقت بھی ساقط العمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ حکم کہ صلوٰۃ کے وقت وضو کرو، پانی ملنے کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر پانی نہ ملے تو تیسرا اُن نے دوسرا حکم (تیمم) کا دیا ہے۔ جب پانی موجود ہوگا تو وضو کے حکم پر عملدرآمد ہوگا۔ جب پانی نہ ہوگا تو تیمم کے حکم پر عمل ہوگا۔ اسی طرح (مثلاً) قرآن نے بھوکوں کو کھانا کھلانے کا حکم دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حکم پر اس وقت تک عمل ہوگا جب ملک میں بھوکے موجود ہوں گے۔ جب کسی ملک کا انتظام ایسا ہو جائے کہ وہاں کوئی بھوکا ہی نہ رہے، تو اس حکم پر عمل درآمد ملتوی ہو جائے گا تاوقتیکہ پھر ایسی صورت نہ پیدا ہو جائے کہ ملک میں بھوکے موجود ہوں۔ قرآنی احکام پر عمل کرنے کی یہ شکل ہوگی۔ یہ نہیں ہوگا کہ ہم اپنے معیار کے مطابق اس کے احکام کو ایک ترتیب دیں، اور جن احکام کو ہم زیادہ قیمتی سمجھیں ان پر عمل کریں اور کم قیمت کے احکام کو ترک کر دیں۔ اسے پھر سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآنی احکام پر عمل کرنے کے لئے دیکھنے کی بات یہ ہوگی کہ کن حالات میں اس کے کونسے حکم پر عمل کیا جائے گا۔ (مثلاً) اس نے عدل کا حکم بھی دیا ہے اور احسان کا حکم بھی۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ معاملہ پیش نظر میں، تقاضا عدل کا ہے یا احسان کا۔ حالات جس حکم کے متقاضی ہوں گے اس پر عمل کیا جائے گا۔ یہ چیز مرکز ملت (یعنی خلافت علیٰ منہاج نبوت۔ یا اسلامی مملکت) کے طے کرنے کی ہوگی۔ یاد رکھئے، قرآن کریم کا نہ کوئی حکم منسوخ ہے۔ نہ اس میں کوئی اختلاف یا تضاد ہے۔ اس کا ہر حکم، اپنی جگہ پر ہمالیہ پہاڑ کی طرح اٹل ہے، اور جب وہ حالات پیدا ہو جائیں جن کے لئے وہ حکم دیا گیا ہے، اس حکم کی اطاعت، فریضۂ خداوندی ہے۔

آخر میں ہم اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے عرض کریں گے کہ اسلامک ریسرچ سے مفہوم یہ ہے کہ

(۱) جو کچھ ہمارے ہاں اسلام کے نام سے مشہور اور رائج ہے، اس کے متعلق تحقیق کیا جائے کہ اس میں کتنا حصہ اسلام کے مطابق ہے اور کس قدر اس کے خلاف۔ اور

(۲) جو نیا معاملہ سامنے آئے تحقیق کے بعد بتایا جائے کہ اس کے متعلق اسلام کا منشا کیا ہے۔

اس کے لئے پہلے یہ متعین کرنا ہوگا کہ اسلام کیا ہے، اور کسی بات کو اسلامی یا غیر اسلامی قرار دینے کے لئے

معیار کیا ہے۔

ان خطوط پر ریسرچ "اسلامک" کہلائے گی۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو اسے "اسلامک ریسرچ" نہیں کہا جائیگا۔
کیا ہم توقع کریں کہ وہ اپنے مجلہ کی آئندہ اشاعت میں اس کی وضاحت کر دیں گے کہ ان کے نزدیک اسلام کیا ہے اور کسی بات کے اسلامی یا غیر اسلامی قرار دیئے جانے کے لئے معیار کیا؟

۲۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ و فاروق اعظمؓ | مصر کے نامور نابینا عالم — فطین — ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب الفتنۃ الکبریٰ۔ کا اردو ترجمہ ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں انھوں نے ضمناً حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی عظمت اور بلندی کا ذکر کیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں، اس ضمنی تذکرہ کی تفصیل ہے۔ اگرچہ یہ تفصیل بھی ہنوز تشنہ ہے۔ اس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ سے متعلق ایک سو بارہ صفحات ہیں اور حضرت عمر فاروقؓ سے متعلق قریب ڈیڑھ سو صفحات۔ نامور مصنف نے اس اختصار کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ

> اس جائزہ کا مقصد شیخینؓ کے دور کے واقعات کی تفصیل بیان کرنا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تمام تفاصیل قدماء اور محدثین کی کتابوں میں پہلے ہی سے بکھری ہوئی ہیں اور میں طول کلام سے احتراز لازم سمجھتا ہوں۔ حق تو یہ ہے کہ شیخینؓ کے دور کے یہ واقعات جس ڈھنگ سے بیان ہوئے ہیں اس نے انھیں میری نگاہوں میں یکسر مشکوک اور مشتبہ کر دیا ہے۔ اور میں تو اس بات کا قائل ہو چکا ہوں کہ شیخینؓ کے مختصر دور کے واقعات کا عام طرز بیان، بجائے اس کے کہ انھیں عہد آفریں بنا کر پیش کرے اپنے اندر افسانویت کا رنگ لئے ہوتا ہے۔ قدماء اور محدثین کے سارے کے سارے دفاتر کھنگال ڈالئے اور دیکھئے کہ واقعات کی اس کھتونی میں کہانی کا عنصر کتنا ہے اور مورخانہ ژرف نگاہی سے کس حد تک کام لیا گیا ہے۔ کیا اس مختصر عہد کی باتوں سے کم از کم جس انداز میں وہ بیان ہوئی ہیں، بوئے افسانہ طرازی نہیں آتی؟

فاضل مصنف نے کوشش کی ہے کہ اس "کہانی" سے افسانوی عنصر کو حتی الامکان الگ کر کے شیخینؓ کی صحیح عظمت کو نمایاں طور پر سامنے لایا جائے۔[1] ان درخشندہ واقعات کا خاتمہ انھوں نے ان الفاظ پر کیا ہے کہ

---

[1] پرویز صاحب اپنے مقالہ "ہماری تاریخ میں کیا ہے" ان افسانوں کی بہت سی مثالیں پیش کر چکے ہیں۔ یہ مقالہ سلیم کے نام خطوط (جلد سوم) میں شائع ہو چکا ہے۔

> حضرت عمرؓ کی وفات سے ایک ایسا دورِ تابناک ختم ہو گیا۔ ایک ایسا عہدِ زریں گذر گیا جس سے زیادہ تابناک اور زریں عہد آنحضرت کی وفات سے قیامت تک جب تک دنیا باقی ہے، پھر نہ آسکے گا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس نامور محقق نے، حقیقت کو افسانوں سے الگ کرنے کے لئے بڑی دقیقہ رسی اور محنت سے کام لیا ہے، لیکن اس کے باوجود بعض باتیں ایسی رہ گئی ہیں جو حقیقت کے خلاف ہیں۔ مثلاً واقعہ افک کے متعلق انھوں نے بھی لکھ دیا ہے کہ وہ حضرت عائشہؓ سے متعلق تھا۔ یا یہ کہ قرآن کریم پہلی مرتبہ حضرت صدیقؓ کے عہد میں جمع اور مرتب ہوا تھا۔ یا یہ کہ وحی کے اکثر احکام حضرت عمرؓ کی خواہش کے مطابق نازل ہوئے تھے۔ اس قسم کے سہو سے قطع نظر اس مختصر سی کتاب میں، مصنف نے ایسے واقعات یکجا کر دیئے ہیں جن سے حضرات شیخین کی عظمت بڑے دلنشین پیرایہ میں سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً حضرت عمرؓ کے معاشی نظام کے متعلق لکھا ہے۔

> ایک چیز جس کی مثال قدیم اور جدید دونوں تمدنوں اور تہذیبوں میں مفقود ہے، کسی حکومت کا تمام رعایا کے لئے غذائی ذمہ داری کا قبول کرنا ہے۔ اس لئے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں تمام مسلمانوں کے کھلانے کی ذمہ داری خود حکومت نے لے لی تھی۔ ..... (نیز) حضرت عمرؓ کے زمانے سے آجتک یہ کبھی نہیں ہوا کہ کوئی حکومت تمام افراد مملکت کے لئے حکومت کے خزانے سے معین مقداریں وظائف بھی مقرر کر دے۔

یہی وہ قرآن کا نظامِ ربوبیت ہے جس میں ہمارے قدامت پسند طبقہ کو کمیونزم کی بو آتی ہے!

کتاب کا ترجمہ رواں اور شگفتہ ہے۔ مترجم شاہ حسن عطا ایم۔ اے ہیں۔ یہ کتاب نفیس اکیڈیمی، بلاسس سٹریٹ۔ کراچی۔ نے شائع کی ہے۔ قیمت مجلد چھ روپے پچھتر پیسے (ضخامت ۲۰۰)۔ افسوس کہ اس میں کتابت کی غلطیاں اکثر رہ گئی ہیں۔

۴۔ تاریخِ فیروز شاہی

سراج عفیف، فیروز شاہ تغلق کے عہد کا مورخ تھا اور بادشاہ کے دربار سے متعلق۔ اس نے فیروز شاہ کی تاریخ لکھی ہے۔ جو مورخ ایک بادشاہ کا درباری ہو، وہ اس کی تاریخ جس قسم کی لکھے گا، وہ ظاہر ہے۔ اس اعتبار سے تو عفیف کی تاریخ قابلِ اعتماد قرار نہیں دی جا سکتی۔ (وہ فیروز شاہ کو زمرۂ اولیائے کرام میں شمار کرتا ہے) البتہ اس نے اس عہد کے جو دیگر کوائف قلم بند کئے ہیں ان کا مطالعہ استفادہ کے قابل ہو سکتا ہے کیونکہ وہ اس کے چشم دیدہ ہیں۔ اس تاریخ کا اردو ترجمہ مدت ہوئی حیدر آباد دکن سے شائع ہوا تھا۔ اب اس کو نفیس اکادیمی کراچی نے شائع کیا ہے۔ کتاب ۲۰x۲۶ کے ۳۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور مجلد کی قیمت آٹھ روپے پچیس پیسے ہے۔

رابطۂ باہمی

(بزم ہائے طلوعِ اسلام کی ماہانہ رپورٹیں)

لاہور ۹ جون کی شام کو بزم کا ماہانہ اجتماع ہوا۔ لاہور کی مقامی لائبریریوں کو طلوعِ اسلام کا لٹریچر مہیا کرنے کی تجاویز زیرِ غور آئیں۔ اس سلسلے میں محترم محمد علی صاحب بلوچ کی وساطت سے نیشنل بنک آف پاکستان کی لائبریری کو "سلیم کے نام خطوط" کا سیٹ اور "اسباب زوالِ امت" کی کاپیاں مہیا کی گئیں۔ درسِ قرآن کے سلسلے میں سپیشل بس کے اجراء کا مسئلہ بھی زیرِ بحث آیا اور اس کے لئے تین ارکان پر مشتمل کمیٹی قائم کر دی گئی جو اس مقصد کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے عملی اقدامات کرے گی۔

پشاور پمفلٹوں کی تقسیم باقاعدگی سے جاری ہے۔ "اسلام کیا ہے؟" اور "کافرگری" کے پمفلٹ اہلِ علم و بصیرت کے حلقوں میں بڑے اثر آفریں ثابت ہوئے ہیں۔ ہر اتوار کی شام کے ساڑھے پانچ بجے (بمقام ۴۴۳، اسکندر پورہ) درسِ قرآن کا آغاز ہوتا ہے۔ اس مجلس میں مفکرِ قرآن کی تقریر بذریعہ ٹیپ سنائی جاتی ہے۔ شرکت کی دعوت عام ہے۔

بوریوالہ پمفلٹوں کی تقسیم کا سلسلہ خوشگوار نتائج پیدا کر رہا ہے۔ نیا پمفلٹ "کافرگری" بالخصوص پسند کیا گیا ہے اور علمی حلقے اس سے بڑے متاثر ہوئے ہیں۔ "اسبابِ زوالِ امت" کی تقسیم اور مطالعہ کے بعد طلوعِ اسلام کی دیگر مطبوعات کی مانگ بڑھ گئی ہے۔ یہ مختصر لیکن اہم کتاب یہاں کافی تعداد میں تقسیم اور فروخت ہوئی ہے۔

لائلپور

بزم کے ماہانہ اجتماع باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ اور لٹریچر کی تقسیم بھی۔ یہاں کی فضا کو مفکر قرآن کی بصیرت قرآنی سے مستنیر کرنے کے لئے ٹیپ ریکارڈر کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ عنقریب یہ انتظام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔

پنڈدادن خاں

بزم کا انتخابی اجلاس خواجہ خدا بخش صاحب کی صدارت میں ہوا اور محترم عبدالرشید صاحب متفقہ طور پر آئندہ سال کے لئے نمائندہ بزم منتخب کر لئے گئے۔ یہاں بہت سے احباب مخالفین کی مخالفت کی زد میں آئے ہیں۔ لیکن وہ پورے صبر و ضبط اور عزم و استقلال سے اپنے مسلک پر قائم اور سرگرم سفر ہیں۔ حافظ عبدالمجید صاحب کو لائبریری کا انچارج مقرر کیا گیا ہے۔

میانوالی

۹ مئی کو بزم کے قیام کے سلسلے میں پہلی بار مقامی احباب کا اجتماع صوفی عبدالرحمان صاحب کے دولت کدہ پر ہوا۔ محترم محمد رفیق صاحب ایڈووکیٹ (صدر بار ایسوسی ایشن) نے اجلاس کی صدارت فرمائی۔ یہاں کی ممتاز شخصیتیں

پروفیسر رفیع اللہ صاحب۔ ڈاکٹر نور محمد خاں نیازی۔ محترم غلام مرتضیٰ خاں صاحب ریٹائرڈ سول انجینیر اور دیگر حضرات نے نہ صرف اجلاس میں شرکت فرمائی بلکہ انتہائی ولولے اور ذوق و شوق سے بزم کی رکنیت قبول کی اور یہ سب احباب پوری ہمت سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں سرگرم کار ہیں۔ عزیز الرحمٰن صاحب قریشی بزم کے نمائندہ مقرر ہوئے ہیں۔ جلد ہی بزم کے دفتر اور دارالمطالعہ کا افتتاح عمل میں لایا جا رہا ہے۔

ادارہ کی توثیق

ادارہ میانوالی میں نئی بزم کے قیام کی توثیق کرتا ہے۔ اور ان ممتاز احباب سے جنہوں نے بزم کی رکنیت قبول فرمائی، قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں بہترین امیدیں وابستہ کرتا ہے۔

(ناظم ادارہ)

کراچی

ہر اتوار کی صبح کے ۹ بجے اولڈ سندھ اسمبلی ہال میں باقاعدگی سے اجتماع عام ہے۔ جہاں مفکر قرآن کا درس قرآن بذریعہ ٹیپ ریکارڈر سنایا جاتا ہے۔ بزم کے حالیہ ماہانہ اجتماع میں طلوع اسلام کی قرآنی فکر کو آگے بڑھانے کے لئے اہم فیصلے کئے گئے۔ مفہوم القرآن کا پہلا پارہ اور نسبات شرف انسانیت ایک ایک ہزار کی تعداد میں باضابطہ طور پر تقسیم کئے جا رہے ہیں۔